مطبوعات بیت الحکمت۔ دہلی (ہند) (۲)

وحیٔ اوّل کا انقلابی پیغام

محمد اجمل خاں

وقال اللہ لا تتخذوا الٰھین اثنین ۚ انما ھو الٰہٌ واحد (النحل)

خدا نے فرمایا ہے کہ یزداں و اہرمن دونوں کو معبود نہ مانو۔ اللہ تو ایک ہی ہے

اعلانِ انقلاب

محمد اجمل خاں

قرآن کریم کا انقلابی طرزِ خطاب

ہر مفکر سوچنے سے پہلے محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نثر سے پہلے نظم وجود میں آیا ہے۔ شعر میں احساسات و جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر فنکار، وہ مصور ہو یا شاعر، موسیقی ہو یا مہندس و بت تراش، اپنے لطیف جذبات تخلیق میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دوسرے بھی خود اس کی طرح محسوس کرنے لگیں۔ اس تخلیق میں نثر کی سی خشک منطق اور محض دماغ کی کارفرمائی نہیں ہوتی شعر میں دل حاکم ہوتا ہے اور دماغ محکوم، اور "معنی" یعنی احساسِ دل، روحانیت کے افق سے طلوع ہو کر الفاظ و استدلال دماغ کی "صورت" کو اپنے نور سے منور کر دیتا ہے۔

حسین تخلیق اگر نثر کی شکل میں جلوہ فرما ہو تو اُسے خطابت کہتے ہیں اس میں عقلی دلائل شاعرانہ معنویت کے ذریعے سامعین کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ لیکن اگر نثر کو محض منطق و عقل کا لباس پہنا دیا جائے تو اس میں شعر و خطابت کی سی اثر آفرینی نہیں رہتی۔

قرآنی طرزِ بیان میں نہ تو شاعری کی سی محض معنویت ہے نہ نثر کی سی محض کرخت منطق۔ اس میں مخاطب کے افکار و ماحول کے مطابق وہ جادو بیانی ہے کہ دل و دماغ دونوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ یہی اس کے الہامی ہونے کا ثبوت ہے۔ اس طرزِ بیان نے دنیائے ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یعنی نثر کو نظم اور نظم کو نثر کے پیرایہ میں لا کر دونوں میں جوشِ نمودِ حیات بھر دیا۔ بہ الفاظِ دیگر عقل و ہوش کی تیرگی کو محبت و شوق کی تابانی سے پُرنور کر دیا۔

فہرست مضامین

اعلان انقلاب یعنی سورۃ العلق

پہلا اردو ایڈیشن ۱۹۵۲ء (۱۳۷۲ ہجری)

زیر نگرانی محمد ذوالفقار حسن فاروقی یونین پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی میں چھپی
اور
بیت الحکمت دہلی (ہند) کی طرف سے سیف الاسلام خاں جامعی نے شائع کی

سول ایجنٹ در ہند: سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی (ہند)
سول ایجنٹ در پاکستان: مکتبہ بیت الحکمت۔ اردو بازار۔ لاہور (پاکستان)
قیمت ایک روپیہ

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم (قرآن)

اے اللہ ہم تیری پناہ میں آنا چاہتے ہیں اور شیطان رجیم سے بچنا چاہتے ہیں

اوم : وشوانی دیو سوترا دری تانی

اوم اے خدائے کائنات سب برائیوں کو

پراسوا ۔ ید بھدرم تنہ آسوا (رگ وید)

پرے کردے۔ جو کچھ بھی بھلائیاں ہیں وہ ہم پر نازل کر

اہرمن دور باش

اہور امزوا نزدیک شو

ازؤن دیو دات (شیطان کو دور کرنے کی دعا)

یعنی وندیداد

اسلام

"اگر ہم یورپ کو دین اسلام کی طرف بلانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ سب سے پہلے ہم یورپ کو یہ یقین دلائیں کہ خود ہم (سچے) مسلمان نہیں ہیں۔ یورپ والے ہمیں قرآن کی روشنی میں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہاتھ کی انگلیوں کے اندر سے کوئی چہرہ دیکھا جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے نام لیوا جہل و نفاق اور کاہلی میں مبتلا ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ واقعی اگر یہ کتاب ایک اصلاح کرنے والی کتاب ہے تو اس کے ماننے والے اس قدر ابتر و پراگندہ کیوں ہیں۔"

(وحی محمدی صفحہ ۱۳۔ از علامہ رشید رضا۔ ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی)

قرآن دانی کیا ہے؟

"قرآن کے سمجھنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کا ترجمہ پڑھ لیا جائے اور اس کے قصے بیان کر دئے جائیں۔ قرآن سمجھنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے۔ یورپ نے ہماری اسلامی سلطنتوں کو تباہ کر دیا، اب اسے یہ یقین دلانا آسان نہیں ہے کہ قرآن کا قانون چل سکتا ہے۔ ہمارا عالم قرآن جانتا تو یہ ہے کہ قرآن خدا کا قانون ہے، اور عملی طور پر مانتا یہ ہے کہ انسانی قانون اس کے اوپر ہے۔"

(امالیٔ عبیدیہ صفحہ ۲۵۸)

زندہ فکر: جس فکر میں زندگی پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے وہ مردہ ہے اس کے پڑھنے پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف قرآن کا فکر ہی ایک زندہ فکر ہے۔ (امالیٔ عبیدیہ ص ۲۷۸)

مقصدِ انسان

تا دل، وجود خویشتن برکندہ نہٗ
در بندِ خودی، خدائے را بندہ نہٗ
گیرم کہ تو جانی و جہاں زندہ بہ تست
تا زندہ بجانان نشوی زندہ نہٗ

(جامیؒ)

مقصدِ انسان، انسانیت کو ترقی دینا ہے۔ انسان کو اُنس و محبت کا پتلا بننے کے لئے ربِ اکرم کا حقیقی بندہ بننا چاہیئے۔ اور حق، حسن و خیر کے تصوّرات کو تصورات عدل، مساوات و اخوت میں دیکھنا چاہیئے۔ سورۃ العلق میں انھیں کرم سے تعبیر کیا گیا ہے اور کریمی مروت و جوانمردی کو اشرف ترین خلق بتایا ہے۔

انسانیت کا خوف و حزن صرف محبت الٰہی سے دور ہو سکتا ہے اس کی مجازی صورت محبت انسانی یا انسانیت میں مضمر ہے جیسے چین میں خوش اخلاقی، عرب میں مروت اور ہند میں اہنسا یا رحم کہتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے دنیا میں حق، حسن، خیر، عدل، مساوات و اخوت عام ہو سکتی ہے۔

انسانیت کے کتابی تصور کو چلانے کے لئے سیاسی اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے اس اقتدار کے حاصل کرنے والوں کی جماعت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاتھ اپنی جانیں بیچ ڈالیں اور دنیا سے بہیمیت، شیطنت، یا بدی کو مٹانے کے لئے جہاد شروع کر دیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ ان کا مقصدِ جہاد برائی کا استیصال ہے۔ بروں کا مٹانا نہیں ہے۔ یعنی ان کا جہاد بروں کی اصلاح کے لئے ہے۔ اس میں خود غرضی و خودی کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ اگر چند مظلوم اپنے اندھے پن سے مجبور ہوں، تو انھیں بجبر ظلم و جہل سے نجات دلانا ہر مجاہد کا فرض ہو جاتا ہے اور انھیں بتلانا پڑتا ہے کہ کتابی آمریت مذکورہ بالا . . اصولوں پر قائم ہے۔

تمہید

اعوذ بِ
اللہ العظیم
من
الشیطان الرجیم

فرقِ است ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست
تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است (حافظ)

حدیبیہ کی فتح مبین (سنہ ۶ھ) کے بعد، رسول عربی صلعم اور ان کے رفیقوں کی کوشش سے دائرہ اسلام میں آنے والے پورے طور پر اسلامی انقلاب کو سمجھ گئے۔ انھوں نے بیعت رضوان کرکے یہ ثابت کر دیا کہ وہ دنیا کو جہل و ظلم سے نجات دلانے کے لئے اپنی جان مال کو اللہ کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ اس کے بعد کتابی آمریت نے خیبر سے ابتدا کی اور چار سال کے اندر نہ صرف عربی قومی انقلاب کی تکمیل کر دی بلکہ عالمی انقلاب کے لئے پہلے صلح جویانہ خطوط اور پھر اللہ والوں کی فوجوں کے ذریعے بجبر تاریکی کو روشنی سے بدلنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۱ھ میں خدا پرستی کا پیغام پہنچانے والے ایلچیؐ نے وفات پائی۔ لیکن پیغام دنیا میں باقی رہا اور خلفاء و رفقائے رسولؐ اس پیغام کی رسالت کا کام دنیا میں کرتے رہے اسی لئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے انھیں متممین رسالت کا لقب دیا ہے۔ ہمارے خیال

سنت کیا ہے؟

سنت یعنی عمل رسول ، قرآن کے عالمگیر قانون سے مستنبط ہے۔ قرآنی اصول نا قابل تبدیل ہیں۔ لیکن قرآن کے اصول کی عمومیت جب کسی خاص قوم کے اعمال کا جامہ پہنتی ہے تو اس کے احوال کے مطابق یہ عمومیت ایک خصوصیت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور ہر قوم و زمانے کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ یعنی اصل نہیں بدلتی لیکن فرع کی شکل میں وہ قابل تبدیل ہوتی ہے۔ فقہ اسلام کی اسی لچک نے قانون قرآن (دین ۔ قانون ۔ صراط ۔ طریق) کو ہر زمانے اور ہر حال کے لئے سرچشمۂ ہدایت بنا دیا ہے۔ اسی لئے یہ زندہ اور ترقی کناں فکر ہے۔ لچک نہ ہو، اور جمود و قدامت پرستی پیدا ہو جائے تو کوئی قانون کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

قریب لانے کے لئے قرآن دنیا کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام دیتا ہے
. . . . اس کا نصب العین هوالذی ارسل
رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله . . . . .
(اس کی تفسیر ازالۃ الخفاء از امام ولی اللہ کی جلد اول کے ابتدائی
صفحات میں ہے)۔

"پارٹی پروگرام قرآن کی متعدد سورتوں میں حزب اللہ
کے لئے تفصیلی احکام دے کر مکمل کر دیا گیا ہے . . . .

. . . .

"ان مفکرین کو دوسرے مرحلہ میں ایسی سوسائٹی کی ضرورت
محسوس ہوگی جو تمام انقلابی نظریات پر حاوی ہو چکی ہو . . . .
. . . . . اسلامی عقائد و اخلاق اور اسلامی حکومت کی
درمیانی کڑی یہی انقلابی سوسائٹی ہے۔ اس کے احکام و
نظریات مشتبہ رہنے سے تسلسل فکر قائم نہیں رہتا۔ اسی کا نتیجہ ہے
کہ ہر زمانے کے لئے مناسب پروگرام بنانے میں قرآن حکیم
سے مدد نہیں مل سکتی ۔ ہمارے فقہاء گورنمنٹ کے احکام بھی
عقائد و اخلاق کی طرح ضبط کر دیتے ہیں، جس سے ایک قسم کا جمود
پیدا ہوتا جاتا ہے ۔ اکثر اہل علم اس ساری داستان سے صرف اس قدر
یاد رکھتے ہیں کہ زانی کا رجم اور چور کا ہاتھ کاٹنا ضروری ہے . . . . .
. . . . گورنمنٹ اور سوسائٹی کے احکام ممتاز کرنے کے
لئے قرآن عظیم کی مکی اور مدنی سورتوں کا متعین کر لینا ضروری
ہے . . . .

"قرآن عظیم کی ہر سورت کے متعلق مفسرین کے پاس روایتیں
موجود ہیں . . . . بعض احکام کی تاریخ ان روایتوں کی تخلیط

میں یہ سب رسول اللہؐ کے رسول تھے۔ اور جو خدائی پیغام رسول عربیؐ اور دوسرے انبیاء لائے تھے، اس کی بنیادوں پر، یعنی رسول عربیؐ کے بتائے ہوئے طریق عمل (سنت فعلی) کی روشنی میں، یہ رفقائے رسول اللہؐ عمل کر رہے تھے۔ غرضکہ جو انقلابی سوسائٹی رسول عربیؐ نے بنائی تھی اُس کی زندگی و حرکت کتابی فکر اور عمل رسول کی پیروی پر منحصر تھی۔ اس انقلابی سوسائٹی کا فکر اس درجہ یقین کے ساتھ عمل سے ہم آہنگ تھا اور اس کی تنظیم ایسے فطری اصولوں پر ہوئی تھی کہ ہر فرد خوش دلی اور خندہ پیشانی سے سرگرم عمل صحیح تھا۔ یعنی اس سوسائٹی میں بدعملی (فساد فی الارض) ناممکن بنادی گئی تھی۔
اس صحیح فکر یعنی نصب العین انقلاب اور صحیح عمل یعنی طریق کار انقلاب کو سمجھے بغیر روح اسلام کا سمجھنا مشکل ہے۔ یہ دونوں باتیں کتب الٰہیہ اور سنن رُسل ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں بشرطیکہ تقابلی مطالعہ کے لئے کتب شیطانیہ اور عمل اخوان الشیاطین (یعنی یہودیت۔ ساحر۔ کاہن سرمایہ پرست اور دوسرے ذہنی اور جسمانی غلام سازوں یا بہ اصطلاح جدید "رجعت پسندوں" کے اعمال) ہمارے سامنے ہوں۔

۱۔ صحیح فکر: قرآن حکیم نے، کتب الٰہیہ کی الہامی ترجمانی کے ذریعے سے جو وحی متلو پیش کی ہے اُس سے جملہ کتب الٰہیہ کی حکمت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

۲۔ صحیح عمل: صحیح عمل وہ وحی غیر متلو ہے جو کتب و حِکم الٰہیہ کی پیروی میں رسول عربیؐ نے اپنی نبوی زندگی میں عملاً کرکے دکھادیا۔ اس سلسلے میں جملہ کتب الٰہیہ قبل قرآن کو سنت نبوی کا درجہ دینا ضروری ہے۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے، ہم نے اسے تاریخی ترتیب سے مرتب کرکے سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع کردیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں حضرت مولانا عبیداللہ بن اسلام سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴ء) تحریر فرماتے ہیں:-

"مسلمان قرآن حکیم کو انسانیت کے لئے آخری پیام ربانی مانتا ہے۔
دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ اس عقیدے کو آج کی ذہنیت سے

کیا کہا جائے کہ قرآنی سیرت تحصیل حاصل ہے یعنی ؂

مرا بسادہ دلیہائے من تواں بخشید　　خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم (نظیری)

اگر قرآن حکیم کو تاریخی ترتیب یعنی ترتیب نزول کے مطابق پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً یہ زندہ فکر اور پیغام انقلاب ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض لوگ شانِ نزول اور ترتیبِ نزول کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ ترتیب نزول قرآنی تعلیم کے پورے سیاق و سباق کو بتاتی ہے اور سیرت نبوی میں قرآن کا تاریخی مقام متعین کرتی ہے۔ شان نزول کا تاریخی ترتیب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس سے نزول کے زمانے کا تعین نہیں ہوتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں آیت یا سورت کس کے لئے اور کیوں یا کن احوال و کیفیات میں نازل ہوئی۔ یعنی شان نزول سے "کب" کا جواب نہیں ملتا، "کیوں" کا مل جاتا ہے۔

بالاتفاق "سورۃ العلق" کی پہلی پانچ آیتیں پہلی وحی ہیں، جو مکہ کے قریب جبل حرا پر ۴۱ عام الفیل کے ماہ رمضان میں آنحضرتؐ کے قلب پر روح الامین کے ذریعے سے نازل ہوئیں۔ اس لئے یہ آیتیں "فاتحۃ الکتاب" ہیں۔ اگر مولانا عبیداللہ بن اسلامؒ سندھی نے سورۃ الفتح کا نام عنوان انقلاب نہ رکھ دیا ہوتا تو ہم ان آیتوں کو عنوان انقلاب سے موسوم کرتے۔ بہرحال یہ آیتیں **"عنوان انقلاب"** ہیں۔ یعنی وجود اور علم کے متعلق ان آیتوں کی دونوں آنکھوں سے نظر ڈالی جائے تو صرف ایک جواب ملتا ہے کہ وجود و علم کا فیضان صرف ذات واجب الوجود سے ہے۔ ہر جگہ اللہ ہی اللہ ہے، یعنی بقول صاحب "گلشن راز" ؂

دلِ یک قطرہ را گر بر شگافی　　بروں آید از و صد بحر صافی

حضرت مُلّا جامی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں کہ جمال وحدت وجود و علم یعنی جمال وحدتِ حقیقی کے عظیم ترین حجاب اور کثیف ترین نقاب تقیدات و تعددات ہیں جو ظاہر وجود میں واقع ہوئے ہیں۔ ذات و صفات کی بحثیں اسی وجہ سے چھڑی ہوئی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ؂

کرنی ہے محقق مفسرین اپنے مسلّمہ نظریات کی مدد سے ان روایتوں کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ روایتی سلسلہ ناقابل اطمینان ہو گیا ہے۔ ....

. ...

"مولانا محمد اجمل خاں ... کا ان مفسرین پر ہمیشہ احسان رہے گا انھوں نے اندرونی شہادت کی مدد سے مکی سورتوں کے معین کرنے کا راستہ کھول دیا ہے اور روایات کے اختلاف سے جو اغلاق پیدا ہوا تھا اُسے دور کرنے کی پوری کامیاب کوشش کی ہے۔"

(پیش لفظ: "ترتیب نزول قرآن کریم")

رسول عربیؐ کی سیرت کے ساتھ ساتھ قرآن کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ ہی اسلامی عمل و فکر کو پورے طور پر نمایاں کرسکتا ہے۔ اگر ہم قرآن کو تاریخی ترتیب سے نہ پڑھیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی فکر کے تسلسل اور ترتیب کو دماغ اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا اور عمل نبوی کے متعلق سطحی اور بسا اوقات قیاسی باتیں بنانا پڑتی ہیں۔ اور جب حقیقت نظر نہیں آتی تو فرقہ بندی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

اس اشکال کو دور کرنے کے لئے ہم نے عمل نبویؐ یعنی سیرت سیدنا محمدؐ رسول اللہ کو بھی قرآن کی تاریخی ترتیب کے ساتھ ساتھ مرتب کرلیا ہے۔ جس کے مطالعے سے فکر و عمل نبوی کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں رہ سکتا۔ اس سیرت کبیر کے خلاصے کا خلاصہ" دہلی سے" سنگم کتاب گھر" نے شائع کردیا ہے۔ بہت ممکن ہے اختصار کی وجہ سے سیرت صغیر میں بعض مضامین تشنہ نظر آئیں۔ لیکن نامسلمانوں کے لئے اتنی مختصر سیرت ہی کافی ہے جو انھیں حقیقت اسلام، اور اس کی انقلابی روح کے سمجھانے میں معین ہوسکتی ہے۔ لیکن قدامت پرست اصحاب اگر قرآن حکیم اور سیرت رسولؐ کریم میں پیغام و عمل کی ہم آہنگی اور انقلاب آفرینی نہیں پاتے تو سوائے اس کے

ربّک

الّذی خلق   الّذی علّم

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

اعلانِ انقلاب

مفہوم سورۃ الفاتحہ یعنی سورۃ العلق

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق و ایں عجب
از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است
(حافظؔ)

رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۶ھ میں عرب کی سرزمین میں سوشل اور معاشی انقلاب کی جو بنیادیں قائم کی تھیں، اور ان بنیادوں پر جس عالمی انقلاب کی عمارت بنائی تھی، اس کی ابتدا سورۃ العلق کی پانچ آیتوں سے ہوئی ہے۔ اسلامی تاریخ انقلاب میں یہی اہم ترین آیتیں ہیں۔ یہ عنوان انقلاب ہی اعلانِ انقلاب ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو خوف، بھوک اور ظلم سے نجات ملے اور وہ اپنے رب کو پہچان کر سہاشید بن جائے ؎

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است
(غالبؔ)

ہمسایہ وہمنشین وہمرہ ہمہ اوست — در دلق گدا و اطلس شہ ہمہ اوست
در انجمن فرق و نہاں خانۂ جمع — باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

اسی لئے ہم امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کی روشنی میں مادہ کو بھی شئون الٰہیہ میں سے ایک شان سمجھتے ہیں (کل یوم ھو فی شان) اور جب حقیقت وجود وعلم کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی انقلابی شان سامنے لائی جاتی ہے تو عقل ونقل وکشف کا تعدد وحدت فکر وعمل میں بدل جاتا ہے۔

ہم نے اس فاتحۃ الکتاب کا نام "**اعلان انقلاب**" اسی لئے رکھا ہے یہ سب فلسفیانہ بحثوں کا خاتمہ کرکے شکوک و اوہام کی کثرت کو وحدت یقین میں بدل دیتا ہے۔ اور فکر وعمل میں یکسانیت پیدا کرکے ظلم و نفرت کی دنیا کو عدل ومحبت کی جنت بنا دیتا ہے۔ وباللہ التوفیق:

بر اوج کمال صبح صادق مائیم — حل نکت وکشف دقائق مائیم
سر حق وخلق از دل ما بیروں نیست — مجموعۂ مجموع حقائق مائیم

(جامیؒ)

محمد اجمل خاں
۱۴ ر اگست سنہ ۱۹۵۲ ہندی

بیت الحکمت۔ دہلی۔ ہند
(سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار)

خلیفہ کے نام پر ہر جگہ ان ہی امویوں کو برسر اقتدار کر دیا۔ اسی مروان اور اس کے دوستوں (عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط وغیرہ) کی وجہ سے آخر کار حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ اسی نے حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو تدوین مصحف عثمانی کی کمیٹی میں شریک نہ ہونے دیا۔ اور آخر کار جب اسے اقتدار حاصل ہوا تو جو قرآن ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس تھا اسے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے اسے نہیں دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ام المومنینؓ کے انتقال کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ مروان کے دھوکے میں آگئے۔ وہ مصحف دیکھنے کے بہانے سے لے گیا اور اسے ضائع کر دیا۔

یہ مصحف حضرت زیدؓ بن ثابت نے جنگ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے حکم اور حضرت عمرؓ کے مشورے سے مختلف اوراق میں لکھ لیا تھا۔ یعنی حفاظ قرآن اور مکتوبہ پرچوں کی دوگونہ شہادت کے بعد پورے قرآن کو صحف میں لکھ لیا تھا اس قرآن کے ہر سورہ میں آیات قرآنی کی ترتیب وہی تھی جو رسول اللہؐ نے حکم خداوندی سے دی تھیں۔ لیکن مختلف سورتوں کی کوئی خاص ترتیب نہیں دی گئی تھی۔ ہر حافظ و قاری جس ترتیب سے چاہتا تھا اور ان سورتوں کو پڑھتا تھا۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے تک سورتوں کی کوئی مقررہ ترتیب نہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ جو مہاجر تھے اُن کے پاس مکی قرآن پہلے تھا اور اس کے بعد مدنی قرآن تھا۔ گویا ایک طرح سے ترتیب تنزیل کے مطابق تھا۔ لیکن جب اہل کوفہ و شام کی ترتیب سورتیں اختلاف ہوا تو حضرت عثمانؓ نے پہلے کاتب قرآن یعنی حضرت زید بن ثابت ہی کے ذریعے اس مصحف کی نقل کرائی جو بعد شہادت عمرؓ ان کی بیٹی ام المؤمنین حفصہؓ کے پاس تھا۔ اس نقل میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ پہلے لمبی سورتیں (طوال) پھر اوسط درجہ کی سورتیں (مئین) اور پھر مختصر سورتیں (مفصل یعنی جن میں جلدی جلدی فاصلہ دیا گیا تھا) لکھی گئیں۔ اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ وہ اس ترتیب سے لکھی جائیں جس ترتیب سے نازل

اگر کوئی قوم چاہتی ہے کہ دنیا میں امن و ترقی کی راہیں کھلیں تو وہ اسلامی فکر (قرآن) اور اسلامی عمل (سیرت نبویؐ و عمل رفقائے نبوی) کی روشنی میں پھر ویسا ہی عالمی پروگرام بنا سکتی ہے۔ جس نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کو امن و ترقی کے راستے پر لگایا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس جماعت کے پاس فکر و عمل کا ایسا عظیم الشان خزانہ موجود تھا وہ خود ذہنی و عملی طور پر تیس پینتیس سال کے اندر کیوں مفلس و نادار بن گئی؟ ظلم و نفرت کا پھر کیوں دور دورہ ہو گیا، اور ترقی کا راستہ کیوں خطرناک بن گیا!!

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے کتابی فکر و عمل سے لاپروائی برتنا شروع کر دی، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ارتجاعی قوتیں اسلامی انقلاب پر چھا گئیں۔ اگر حضرات ابوبکر و عمرؓ نہ ہوتے تو قرآن کا حکم چلانے والی جماعت اور جماعت کے ساتھ کتابی حکومت ۱۱ھ ہی میں ختم ہو جاتی۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کے ارتجاع کے اسباب بھی وہی تاریخی و فلسفیانہ اسباب ہیں جو ہر قوم کی واماندگی تباہی اور زوال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً :-

(۱) فکر و عمل سے لاپروائی کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ نہ تو قرآن حکیم کی تدوین (۳۰ھ) ترتیب تنزیل کے مطابق کی گئی نہ رسول اللہؐ کا طریق کار یا عمل و سنت رسولؐ تاریخی ترتیب سے قرآن کے ساتھ ساتھ نمایاں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں آنے والوں کے لئے احیائے اسلام و قیام دولت کتابیہ کا تاریخی پروگرام ہی مبہم ہو گیا۔

(۲) دوسری اہم وجہ وہ نومسلم تھے جو اپنے ساتھ اپنے فرسودہ عقائد لائے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فکر و عمل اسلام کے دشمن، یعنی بنو امیہ بکراہت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ کے برسر اقتدار آتے ہی مروان بن الحکم کی ریشہ دوانیوں نے بوڑھے نیک دل اور کمزور طبیعت

اُجاگر کر دیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق میں خالص عربی یا شافعی فقہ بنی اور عربی دنیا میں پھیل گئی۔

پھر عباسی خلافت کے دور میں عجمی (یعنی غیر عربی یا آرین) تصورات کے اثرات قدرتاً زائد ہو گئے۔ یونان و سکندریہ کے فلسفے اور ایران کے زرتشتی و مانوی تصوف نے قانون اسلام کے عربی رنگ پر عجمی رنگ چڑھا دیا جو فقہ حنفی کی شکل میں نمایاں ہوا۔ اور بغداد سے جو مخلوط عربی و عجمی فقہ مامون الرشید کے زمانے میں شروع ہوئی تھی وہ عباسی خلافت کے زوال کے بعد بخارا سے غزنین اور وہاں سے دہلی پہنچ کر خالص عجمی رہ گئی۔

اسی طرح قرآن کی اساسی تعلیم، سنت نبوی کی قومی تعبیروں سے گزرتی ہوئی مختلف ملکوں میں پہنچی اور نئے نئے لباسوں میں ظاہر ہوئی۔ ان لباسوں میں اگرچہ قرآن کی اساسی پاکیزگی باقی نہ رہی، لیکن قرآنی اصولوں کی قوت محرکہ کا بہت بڑا اثر باقی رہا۔ اس اثر کو جب مسلمانوں نے اپنی بے عملی سے بالکل کھو دیا تو خدا کا فطری قانون دوسری اقوام میں نمودار ہوا۔ اور نام نہاد مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ یہ معاشی و سوشل رجحانات اصلی اسلام اور قرآن کے منافی ہیں۔

حالانکہ اگر ترتیب نزول قرآن کے مطابق قرآن کو ہم از سر نو پڑھیں، اور پھر اس کے بعد عمل رسولؐ یعنی سیرت کا تاریخی مطالعہ کریں تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن و سیرت کا فطری طریق کار ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو انسانیت کو جمود سے نکال کر بام ترقی پر لے جا سکتا ہے۔ اور اس نے انقلاب کے جو تاریخی ادوار بنائے ہیں ان سے انسانی معاشرہ کا تاریخی ترتیب سے گزرنا لابدی ہے۔

یہی نہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کی پہلی تعلیم میں ارباب من دون اللہ کے خلاف جو اعلان بغاوت ہے وہی حقیقی معنوں میں **اعلان انقلاب** ہے۔ اور تخلیق و تعلیم الٰہی کی بنیادوں پر جو عادت تعمیر ہوئی ہے، وہی حقیقی اسلام ہے۔ شک کو یقین، ضلال کو ہدایت اور ظلمت کو

ہوئی تھیں۔ البتہ اس کا اہتمام تھا کہ تلفظ الفاظ میں قریش کے تلفظ پر املا کیا جائے اور تین قرشی یعنی عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کے مشورے سے صحیح قرشی تلفظ کے مطابق لکھیں۔

چونکہ ہماری رائے میں قرآن کا ہر رکوع ایک مضبوط و محکم سورت کی حیثیت رکھتا ہے، اور ان رکوعوں (پیراگرافوں) کا نزول نجماً نجماً اور ایک خاص تاریخی تسلسل کے ساتھ ہوا ہے۔ اس لئے بعض سورتوں میں ان رکوعوں کی ترتیب تاریخی نہیں ہے۔ قرآن کی داخلی شہادت سے یہ بات ثابت ہے۔ لہذا ہم یہ تو مانتے ہیں کہ ترتیب آیات فی السور توقیفی ہے۔ لیکن بعض رکوعوں (یعنی مفصل سورتوں) کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ترتیب بھی توقیفی تھی۔ چونکہ موجودہ مصحف یعنی مصحف عثمانی میں مختلف سورتوں کی ایک قرأت یعنی ایک ہی ترتیب قائم کر دی گئی۔ اور دوسرے صحابیوں کو مختلف قراتوں (یعنی ترتیبوں) سے روکا گیا۔ اس لئے موجودہ مصحف سے قرآنی تعلیم کی تدریجی تاریخی تعلیم نہیں معلوم ہو سکتی بہر حال روایات موجود ہیں اور قرآن کی داخلی شہادت بھی اس کے لئے کافی ہے کہ قرآن کی کون سی سورۃ کس زمانے اور احول میں نازل ہوئی۔ اگر مصحف علیؓ بھی عام ہوا ہوتا تو تفسیر و تاریخ اسلام میں کوئی اشکال نہ ہوتا۔ بہر حال یہ کہنا کہ عجمی مسلمانوں کی وجہ سے فکر و عمل اسلامی میں آمیزش ہوئی، صحیح نہیں ہے۔ اصلی تدلیس اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب سے کہ خود وہ اموی نومسلم دائرۂ اسلام میں آکر برسر اقتدار ہوئے جنھوں نے بیس سال تک یعنی فتح مکہ تک اسلام اور بانی اسلام کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

خلافت راشدہ کے بعد، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تدوین قرآن ۳۰ھ کے بعد ہی بنو امیہ کی سیادت اصلی اسلام پر چھا گئی اور تفاخر نسل و قصاص و نخوت جاہلیہ جسے آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع میں اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا سطح پر آگئی اگرچہ اسلام نے اس خالص عربی ذہنیت کی برائیوں کو ایک حد تک کم اور خوبیوں کو

پہلی وحی کا پس منظر

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سنہ ۵۷۰ مسیحی میں ہوئی۔ اور سنہ ۶۳۲ مسیحی میں آپ نے وفات پائی۔ یہ زمانہ چھٹی اور ساتویں صدی مسیحی کا درمیانی زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ انسان اس دنیا میں برابر ترقی کی طرف جا رہا تھا۔ بابل، مصر، سندھ اور یمن میں ایسے آثار موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ نو ہزار سال سے ان ملکوں میں تمدنی ترقی ہو رہی تھی۔ اور مختلف قومیں اپنا اپنا مذہب، فلسفہ اور سائنس اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنی مصنوعات کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے تک پہنچا رہی تھیں۔ کبھی جنگ کے ذریعے سے ایک قوم کے غلام دوسری قوم کے فاتحوں کے لئے ذریعۂ معلومات بن جاتے تھے۔ کبھی امن کے ذریعے سے ایک قوم کے تاجر دوسری قوم کے تاجروں اور عوام تک اپنی بیش بہا مصنوعات اور ان کے ساتھ ساتھ اپنے قومی افسانے پہنچاتے رہتے تھے۔

ساحر و کاہن: ننھے محمد (صلعم) نے آنکھ کھلتے ہی یہ دیکھا کہ شہری ہو یا بدوی ہر عرب کا باشندہ سحر و کہانت اور نجوم کے ذریعے سے اپنی زندگی کی راہ بناتا ہے۔ اور پیشہ ور ساحروں اور کاہنوں، نجومیوں اور پروہتوں کا جال ہر طرف بچھا ہوا ہے۔ وہ خود پروہتوں کے خاندان سے تھے۔ اس لئے سدنۂ قریش کی دسیسہ کاریوں سے اسی طرح واقف تھے جس طرح حضرت ابراہیم خالدیہ میں، حضرت موسیٰ مصر میں، حضرت گوتم بدھ ہند میں اور حضرت زردشت میدیہ میں اپنے اپنے خاندانوں کے پروہتوں اور غیب کا حال بتانے والوں کے اوچھے طریقوں سے واقف ہو کر ان کے

لوٹوں سے بدلنے کا صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو لوگوں میں
خدا سے محبت اور شیطان سے نفرت پیدا کی جائے۔ اس بنیادی اساس پر
پورے قرآن اور مکمل سیرت نبوی کو قائم کرنے کے بعد ہی اسلام کے حقیقی و
بنیادی خط و خال نمایاں ہو سکتے ہیں۔

گویا جبر سے نکل کر قدر کے عالم میں آدم کا آنا ایسا ہی ہے کہ اسے جنت سے ہبوط کا نام دیا جائے۔

شرک کیا ہے؟

غرضکہ چالیس سال کی عمر تک جناب محمدؐ الامین اسی سوچ بچار میں رہے کہ انسانیت کو کس طرح اس "ضلال" یا شک اور بے راہروی سے نکالا جائے جس کی وجہ سے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد آدم ثانی حضرت نوحؑ کی اولاد گناہ میں آلودہ ہوتی رہی اور وہ "ظلم" یا بے اعتدالی و تاریکی کیا تھی جس کی وجہ سے ہبوط آدم ہوا۔ اور خود حضرت آدم اور ان کی اولاد یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ربنا ظلمنا انفسنا (خدایا ہم نے اپنے انفس پر ظلم کیا)

یہ ظلم درحقیقت وہ دھوکا تھا جس کی وجہ سے حضرت آدم نے شجر علم اور شجر زندگی کے پھل کھانے کی نافرمانی اور کوشش کی تھی۔ مقصد اس تمثیل کا صرف یہ ہے کہ جب سے انسان دنیا میں آیا ہے اس کی ایک بڑی جماعت خدائی احکام میں شیطانی احکام کو شریک کرتی رہی ہے۔ اس شرک فی الاطاعت کا بڑا محرک ہوائے نفس (وسواس الخناس) ہے۔ اسی کو قرآن نے آگے چل کر بتایا ہے کہ شرک یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات نفسیانی کی پرستش کرنے لگے اور ہوائے نفس کو اپنا اِلٰہ یا معبود مان لے (من اتخذ الٰہہ ھواہ)

آنحضورؐ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہوائے نفس (شیطان) کی بندگی ہی شرک ہے۔ اس کی بنیادی وجہ خود غرضی اور لالچ ہے۔ لالچ سے انسان دوسرے کے قتل پر تیار ہو جاتا ہے اور کینہ پروری اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اسی کی وجہ سے قابیل ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اسی کی وجہ سے کنس اور فرعون ہزاروں معصوم بچوں کو قتل کراتے رہیں گے۔ اسی لالچ اور ہوس جاہ کی وجہ سے دنیا میں ہمیشہ جنگیں ہوتی رہیں اور اسی لوبھ میں پھنس کر انسان مشرک اور ملحد بنتا رہے گا۔ اور ساحروں، کاہنوں، پروہتوں، شاعروں

خلاف بغاوت پر مجبور ہوئے تھے۔

بچپن گزرا۔ طفولیت میں اپنے چچا کے ساتھ نئے ملکوں کی سیاحت کی۔ اور چالیس سال کی پختہ عمر تک خود بحیثیت تاجر کے عرب اور بیرون عرب کے چپے چپے کو آپؐ نے دیکھا۔ اور ہر جگہ یہی نظر آیا کہ ان کے دادا ابراہیمؑ (۲۱۹۱ سال قبل مسیح) کی بغاوت اور آتشین مصائب میں گزرنے سے پہلے حضرت نوح (۴۰۰۴ سال قبل مسیح) کے طوفان سے بھی بہت پہلے، یعنی ابتدائے تمدن انسانی سے آدم اور آدم کی اولاد کا دشمن نفس امارہ رہا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا حربہ خود غرضی کا خنجر ہے جو برابر آدمؑ اور اس کی اولاد پر چلتا رہا ہے۔ ابلیس (دھوکا دینے والے نفس) نے انسان اول کو لالچ اور ہوس میں مبتلا کر دیا۔ وہ ہمیشہ کی زندگی اور علوم خداوندی کی لالچ میں باغ عدن کی جنت سے نکلے اور اپنی اولاد کو محنت و مشقت کی زندگی میں پھنسا گئے۔ اگر اسے اسرائیلی استعارہ سمجھا جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان اپنے بچپن کی بے فکری اور سادہ لوحی سے نکل کر تجربہ اور مشقت کی زندگی میں آن بسا۔ اور قدرت نے اسے ایسا شعور بخشا کہ وہ اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر خود اپنے آپ کو خوف و جوع سے بچائے اور اپنے اعمال کا جواب دہ یا ذمہ دار قرار پائے۔ بالفاظ دیگر وہ حیوانیت سے نکل کر سمجھدار اور ناطق انسان بن گیا۔ اور اسے اختیار مل گیا کہ اپنا دین (قانون زندگی) ایسا بنائے کہ گویا شجر علم کا پھل کھا چکا ہے۔ اور اچھے برے کی تمیز کا شعور حاصل ہو گیا ہے۔ اسے اختیار مل گیا کہ اس دنیوی زندگی میں دین حق (دین فطرت) پر چلے یا دین باطل (غیر فطری و شیطانی) طریقے اختیار کرے کسی ایک طریقے (دین۔ دینا۔ دھیا۔ راہ۔ ریت۔ ستریت بسطراطا۔ صراط) پر چلنے پر وہ مجبور نہ تھا۔ اس مجبوری کے دور ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار پایا کہ اگر وہ اچھا عمل کرے تو اچھی جزا ملے اور برا عمل کرے تو ویسی ہی سزا پائے

یہ باتیں کرو۔ مثلاً غریبوں کی مدد کرو۔ عدل وانصاف کرو۔ سچ بولو۔ رحم کرو فیاضی کرو وغیرہ وغیرہ۔

اگر آپ قرآن کا تنزیلی ترتیب سے مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہو گا۔ کہ ابتدائی دور میں آنحضرت بطور منذر (نواہی سے بچانے والے) اور مزکی (اوامر کا حکم دینے والے) کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن ان کا کام یہیں ختم نہیں ہوا۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔ قرآن میں تدبر کیجئے، تو معلوم ہو گا کہ آنحضرت نے انبیائے اولی العزم ان رسولوں کو بتایا ہے جنھوں نے لوگوں کو ایک سلطنت قائم کرنے میں مدد دی۔ اور انھیں سلطنت و معاشرت کے لئے ایک قانون (شریعت) دیا۔ حضرات ابراہیم وموسیٰ، داؤد وسلیمان، اور بعض بادشاہوں کا بھی اسی ضمن میں ذکر ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کو فلسفیانہ طریقے پر اخلاقی قدریں بتا دینا کافی نہیں ہے بلکہ ان قدروں کی بنیاد پر جب تک ایک کتابی سلطنت نہ قائم کر دی جائے مقصد اسلام حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی لئے آنحضرت نے قرآن کے ذریعے ان اخلاقی قدروں کو سمجھایا جو انسان کے لئے ضروری بلکہ اہم ہیں۔ پھر ان اخلاقی قدروں (یعنی فلسفۂ اخلاق) کی بنا پر ایک ایسی کتابی سلطنت قائم کر کے دکھادی جو دنیا والوں کے لئے نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ قیام سلطنت کتابیہ کے دوران میں کتاب اللہ کی جو عملی تفسیر آنحضرت نے فرمائی اسی کو ہم سنت نبوی کہتے ہیں۔ اور سیرت نبوی کو قرآن کے ساتھ ساتھ پڑھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔

غار حرا کی وحی اول اس انقلاب کا پہلا اعلان ہے۔ اسی اعلان نے انسان کی مادی اور معاشی ضلالل و بے راہ روی کو امن ودوستی سکھائی۔ جس کا لازمی نتیجہ فارغ البالی اور روحانی طمانیت ہے۔

اور ادیبوں کی ایسی جماعتیں بھی بنتی رہیں گی کہ ذاتی منفعت کے لئے جذبات کا نامعقول استعمال کریں۔ اور اپنی خواجگی منوا کر دنیا کو غلامی اور خوف کے دریا میں غرق کر دیں۔ یہ اثر تھا جو آنحضرتؐ نے عربی معاشرت و تاریخ سے حاصل کیا اور اسی شرک و خود غرضی کو آدمؑ سے موجودہ عہد تک انسانی تباہی کی تہ میں کارفرما پایا (والعصر ان الانسان لفی خسر۔ تاریخ انسانی شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں اس لئے ہے) کہ اس نے اللہ پر بھروسہ چھوڑ دیا ہے اور حق کی جگہ باطل یعنی خود غرضی و شیطنت اس کے خیال پر چھا گئی۔ اسی حرص و ہوا (لوبھ، لالچ) کی وجہ سے انسان معصیت الٰہی کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہی شرک ہے یعنی شیطان کی طاعت اللہ کی طاعت پر غالب آجاتی ہے۔ اس نافرمانی (شرک فی الطاعت) کی وجہ سے حضرت آدمؑ تک معتوب ہوئے۔ اور اسی شرک نے دنیا کی کل قوموں کو تباہی میں ڈالا۔ عاد و ثمود، قوم لوط و قوم فرعون اور جتنی اقوام تباہی میں پڑیں وہ شرک کی وجہ سے پڑیں۔ غرضکہ شیطان پرستی یا نفس پرستی کو آنحضرتؐ نے وجہ زوال اقوام قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کوئی ملحد بھی انکار نہیں کرسکتا۔

تنزل کا علاج: لیکن اس سلسلے میں آنحضرتؐ نے یہی نہیں کیا کہ وجوہ ضلال معلوم کئے۔ آپؐ نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ شک سے یقین، اور ضلال سے ہدایت پر لانے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟

انسانی پستی کا ایک علاج تو وہ ہے جو اکثر انبیاء، حکما، صلحا اور ھادی کرتے آئے ہیں۔ یعنی اپنے اپنے طریقے سے عامۃ الناس کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ برے کام نہ کرو۔ اسی لئے قدیم اقوام کے جتنے منذر و ہادی گزرے ہیں وہ اوامر کم اور نواہی زیادہ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً قتل نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ زنا نہ کرو۔ کسی کو دکھ نہ پہنچاؤ۔ شرک نہ کرو جھوٹ نہ بولو وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک زمانہ آیا جس میں ہادیوں نے یہ بتایا کہ

فلسفۂ عالم اور فکرِ محمدیؐ

خندہ از گل، گریہ از ابرِ بہار آموختیم
من ز ہر صاحبدلے یک شمہ کار آموختیم
(غالب)

عمل سے پہلے فکر ضروری ہے: یہ ایک مسلمہ ہے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے انسانی دماغ میں اس کام کے کرنے کا تصور اور ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے چالیس سال کی عمر تک آنحضرتؐ مختلف تجربات حاصل کرتے رہے۔ اپنی قوم اور دوسروں کے عروج و زوال کے نقشوں پر نظر ڈالی اور اپنے عہد کی رومی و ایرانی کش مکش پر غور کیا، اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ شیطان پرستی ہی نے امن کی جگہ خوف، سیری کی جگہ بھوک، سرور کی جگہ حزن اور آزادی کی جگہ غلامی پھیلا رکھی ہے۔ خوف و حزن، جوع و رقیت لوازمات کفر میں سے ہیں، اور ان سے نکلنے کا نام ہی اسلام ہے۔ یہ اسلام طاعت الٰہی کا دوسرا نام ہے اسی کو صراط مستقیم بھی کہتے ہیں (ان اللّٰہ ربی و ربکم فاعبدوہ۔ ھذا صراط مستقیم ۰)

غرضکہ جب آنحضرتؐ کا ایک فلسفۂ زندگی بن گیا اور آپ نے خدا پرستی ہی کو ذریعۂ نجات مان لیا تو آپؐ نے مختلف اقوام کو صراط مستقیم پر ڈالنے کا ارادہ کیا اسی لئے سب سے پہلے آپؐ نے شیطان (وسواس الخناس یا ہوائے نفس) پر لعنت بھیجی اور نسلِ انسانی کے اس دشمن کے مقابلہ میں اللہ سے مدد مانگی۔ اسی کا نام "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" ہے۔

آپ کو تعجب ہوگا۔ کہ دنیا کی ان اقوام میں جو مختلف خداؤں (یا دیوتاؤں)

یہی ایک طریقہ ہے کہ انسان شرک سے بچے اور خوف و جزع سے نجات پاکر یکّا موحّد اور مومن باللہ بن جائے۔

آنحضرتؐ کی پوری سیرت یہی بتاتی ہے کہ آپ نے کس طرح دولت کتابیہ قائم کی اور حضرت آدمؑ کے وقت سے جو لالچ کا زہر شرک بن کر انسان کے خمیر میں پڑ گیا تھا اسے کس طرح پہلے وعظ و نصیحت سے اور پھر بجبر و زور دور کیا۔

فلسفہ یا فکر انسانی کے مختلف نظریئے

دنیا والے ہزاروں سال سے خیالی جنتیں بنا رہے تھے، لیکن اس جنت میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک نیا جہنم ہے، اور عذاب کی نوعیت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لوٹنے والی ارتجاعی قوتوں کی بنیاد خود غرضی و حرص و آز پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو مفکر یا جماعت بھی نظام نو یا نئی جنت بناتی ہے اس پر چند ہی دنوں میں ارتجاعی خود پرست قبضہ کر کے پھر اسے جہنم بنا دیتے ہیں، بقول غالب ؎

جنت نکند چارۂ افسردگیٔ دل　　تعمیر باندازۂ ویرانیٔ ما نیست

آخرکار چھٹی صدی کے اواخر میں رسول عربیؐ پیدا ہوئے۔ اور ۶۱۰ء میں اُن پر یہ شرح صدر ہوا کہ دنیوی جہنم کو بدلنے کا طریقہ صرف وعظ و مجاہدہ و تزکیہ نہیں، بلکہ خدا کا قانون جاری کرنے والی مجاہدین کی جماعت تیار کر کے ایک دولت کتابیہ قائم کرنا ہے۔

ایں راز کہ در سینہ نہان است، نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت　(غالب)

اس مقصد کے تعین کرنے کے لئے آپؐ ہر سال مکہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک روشن کھوہ کے اندر رمضان (نومبر دسمبر) کا سرد موسم گزارا کرتے تھے۔ یہاں آپ کے تصور میں نہ صرف اپنے بچپن کی زندگی۔ یتیمی، بے مائگی، نکاح و فراغت مالی کے واقعات ذہن میں آتے تھے، بلکہ آپؐ یہ محسوس کرتے تھے کہ رات ہو یا دن کسی وقت خدا نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ قنوط و یاس کا کبھی حملہ نہیں ہوا۔ بلکہ

کی پرستش کرتی ہیں، ان میں اچھے اور بُرے دونوں قسم کے دیوتا مانے جاتے ہیں اور دونوں قسم کے دیوتاؤں کو مختلف قسم کی قربانیوں اور نذرانوں (یا رشوتوں) سے خوش کیا جاتا ہے۔ بلکہ بُرے دیوتاؤں کی شرارت سے محفوظ رہنے کے لئے ان کو زیادہ رشوتوں یا قربانیوں سے خوش کیا جاتا ہے۔ انتہا یہ ہوگئی کہ بعض فرقے صرف شیطان پرست بن گئے۔ اس لئے کہ خدائے خیر کے خوش رکھنے سے زیادہ خدائے شر کو خوش رکھنا زیادہ قرین مصلحت ہے۔ (اس قسم کا ایک فرقہ یزیدی ایران و عراق میں اور بام مارگی ہندوستان میں اب تک موجود ہے۔ آخرالذکر گوشت خوری، شراب نوشی اور زنا کو نجات کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں اور اپنے اعمال کو راز میں رکھتے ہیں۔ قرآن نے انھیں اصحاب الشمال کہا ہے۔ بابل میں اشتر دیوی اور عرب میں لات منات اور عُزّیٰ کی بھی پرستش اسی قبیل سے تھی)

عام طور پر خداؤں کی تقسیم اچھے اور بُروں پر ہوئی۔ پھر ان کا ایک ایک بادشاہ یا بڑا خدا مان لیا گیا۔ ایک خدائے ایزدھا اور دوسرا خدائے دیواں ایک کو اوستا نے اہورامزدا (ہرمز) اور دوسرے کو اہرمن قرار دیا۔ اور پرستش میں ثنویت شروع ہوگئی۔ یعنی ہرمز کی سلطنت آسمان پر اور اہرمن کی زمین پر قرار پائی۔ لیکن زرد اُشتر نے اس تصور کو باطل قرار دیا اور اہورامزدا ہی کو واحد خدائے کائنات تسلیم کیا۔ اس کی کتاب ون۔ دیو۔ داد (وندیداد) درحقیقت دیووں یعنی شیطانوں کو دور کرنے کے منتر ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ سب تعوذ کی شکل میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ہیں۔

فلسفے کا کام یہ بھی ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ یہ عقائد کیوں پیدا ہوتے ہیں اور ایک زمانے میں کیوں ایک نظریہ مقبول ہوتا ہے اور دوسرے زمانہ میں دوسرا کیوں پسند کیا جاتا ہے؟ یعنی مختلف زمانوں میں مختلف عقیدے کیوں اور کس طرح بدلتے رہتے ہیں؟

پہلا کام یعنی عقائد کی جانچ اور ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش سقراط کے زمانے میں یونان میں شروع ہو گئی تھی۔ ہند اور چین میں یہ کام سقراط سے پہلے شروع ہو گیا تھا۔ اور چونکہ عرب سے مختلف قوموں کی تجارتی گزرتی تھی اس لئے ہند۔ ایران۔ یونان اور روم کے فلسفے (حکمت) اور کتاب (قانون) کے متعلق ہر طرح کے خیالات مکہ میں عام ہو گئے تھے، لیکن ان کی تحقیق رسولؐ عربی کے زمانے سے پہلے شروع نہیں ہوئی تھی۔ مکہ اگرچہ بلخ و سکندریہ کی طرح دنیا کی قوموں کا سنگم تھا، لیکن جیسا کہ قرآن کہتا ہے وہاں رسول عربیؐ سے پہلے کوئی ایسا مفکر یا نبی نہیں پیدا ہوا جو اس کو ایک قوم بنا دیتا اور ایک فلسفۂ زندگی اُن کی زبان میں ان کے سامنے رکھتا۔

دوسرا کام، یعنی عقائد انسانی کیوں بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی قرآن نے قدیم اقوام عاد۔ ثمود۔ بنو اسرائیل۔ مصری قوم اور دوسری قوموں کی ترقی اور زوال کا فلسفیانہ مطالعہ پیش کیا ہے اور ہر قوم کی ترقی یا تباہی کو نتیجہ بتایا ہے ان کے فلسفہ اور عمل کا۔ یہ سب تحقیق ابتدائے آدم سے رومن سامراج اور ایرانی شہنشاہیت کے اس دور تک کی قرآن میں تاریخی تسلسل کے ساتھ خطابی رنگ میں پوری پوری پائی جاتی ہے۔ ترتیب نزول قرآن سے فلسفہ اور تاریخ کا یہ پہلو زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن نے فلسفہ یا حکمت تک پہنچنے کے مندرجہ ذیل مدارج بتائے ہیں جنہیں ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے۔

۱۔ خوف اور بھوک

انسانی تمدن، تہذیب یا کلچر میں جو عناصر کام کرتے ہیں ان میں سب سے پہلا عنصر تو جسمانی بھوک اور

خدا نے وہ خود اعتمادی پیدا کر دی جس نے زندگی کو ہمیشہ پُر امید، اور آنے والی حالت کو پہلے سے بہتر بنائے رکھا (وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ) آپ نے دیکھا کہ پہلے بھی بہت سے مفکر زندگی کے معمّے کو حل کرنے میں اپنی عقل کو کھپا چکے ہیں، اور لوگوں کو فارغ البالی، خوش حالی اور نجات کا راستہ بتا چکے ہیں۔ مثلاً کوئی حقیقتِ وجود معلوم کرکے اپنا رستہ (صراط) متعین کرنا چاہتا تھا، کوئی حقیقتِ علم معلوم کرکے صحیح علم کو ذریعہ نجات بنانا چاہتا تھا پھر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خود انسان کی اس کائنات میں کیا جگہ ہے۔ ہم مختصراً ان مسائل کو درج ذیل کرتے ہیں۔

فلسفے کے دو بنیادی مسئلے (نظریۂ ہستی و نظریۂ علم)

ہر قوم کا بلکہ ہر انسان کا کچھ نہ کچھ فلسفہ ہوتا ہے اور یہ فلسفہ مختلف تاریخی و تعلیمی احوال سے بدلتا رہتا ہے۔ عربی میں فلسفہ کو حکمت کہتے ہیں اور قرآن میں جابجا یہ کہا گیا ہے کہ قرآن کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ قرآن نے "کتاب" علم و قانونِ حیات کو کہا ہے۔ اور حکمت اس فلسفۂ حیات کو جس پر قانون کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں یعنی علم و فلسفۂ حیات کا فیضان خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ کسی اور ہستی کی طرف سے نہیں ہوتا۔ "یعلمہ الکتاب والحکمۃ" اس ثبوت کے لئے کافی ہے۔

فلسفے کے دو بنیادی مسئلے ہیں: (۱) یہ کائنات کیا ہے، (۲) انسانی علم کیا ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان عقائد کا انسان کے عمل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

فلسفہ و حکمت کا یہ کام ہے کہ مندرجۂ بالا دو مسئلوں کے متعلق انسان نے جو عقائد قائم کر لئے ہیں ان کی جانچ کرے اور انھیں مرتب کر دے۔

(الف) فلسفۂ ہستی (یا نظریۂ وجود)

وجود یعنی ہستی کی حقیقت کے متعلق مختلف سوچنے والوں نے مختلف نظریئے بنائے ہیں۔ یہ کائنات کیا ہے، وجود کی حقیقت کیا ہے، یا دوسرے لفظوں میں جو کچھ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہے، وہ درحقیقت ہے؟ یا صرف دھوکا ہے؟

سوچنے والے انسانوں کے دل میں اس سوال کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی، جب وہ زمین آسمان اور قدرت کے کارخانے پر نظر ڈالتے تھے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ ہر چیز حیرت کا باعث تھی۔ سورج، چاند، تارے رات کو؛ پھول، پھل، پرندے، جانور دن کو؛ اور خود اپنی ذات ہر وقت ایک گورکھ دھندا بنی رہتی تھی۔

۱۔ روحانیت

کوئی کہتا تھا کہ دنیا میں ہر چیز جان دار ہے۔ پھول اور درخت ایک دوسرے سے اسی طرح باتیں کرتے ہیں جس طرح پرندے اور جانور ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے ہیں۔ انسان ہی کو یہ شرف حاصل نہیں کہ وہ سوچتا سمجھتا اور بولتا ہے۔ بلکہ ہر شے کسی نہ کسی پیرائے میں اپنے "خیالات" دوسرے کو پہنچاتی رہتی ہے۔ غرضکہ جن چیزوں کو ہم بے جان یا غیر ذی روح کہتے ہیں انھیں بھی لوگ جاندار سمجھتے تھے۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ جاندار اور بے جان کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ پرندے جانور اور انسان وغیرہ جو اپنے ارادے سے حرکت کر سکتے ہیں وہ تو جاندار ہیں، اور بقیہ کائنات میں درخت پودے یا گھاس وغیرہ نہ تو بالکل بے جان ہیں نہ پورے طور پر جاندار، اور جو چیزیں بالکل حرکت نہیں کر سکتیں وہ بے جان ہیں۔ اس کے بعد انسان کی روح کو حیوانات اور نباتات کی روحوں سے اونچا درجہ دے دیا گیا اور کہا گیا کہ حقیقت میں انسان کی

حفاظت جان کے فطری رجحان کا ہے یعنی اقتصادی انسان کے لوازم: محنت زراعت، تجارت، گروہ بندی اور اپنی حفاظت کے لئے ایک سلطنت، جس کے قوانین ایسے اخلاقی قوانین یا رسوم پر قائم ہوں جو انسان نے اپنے تجربہ سے عام مفاد کے لئے رائج کر لئے ہوں۔ (سورہ قریش)

۲۔ تجربہ و مشاہدہ (علم کتاب) معاشی بہتری اور حفاظت جان کے لئے قوانین قدرت کا علم ضروری ہے۔ اور انسان کو ایسا علم (یعنی سائنس) رفتہ رفتہ مشاہدہ و تجربے سے حاصل ہوتا رہتا ہے، اور اس کو وہ اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا سیکھ جاتا ہے (سورۃ العلق)

۳۔ علم اور علم غیب وہ عقیدے جو ماورائے فطرت، یا ماورائے تجربہ ہوتے ہیں۔ مثلاً مرنے کے بعد کی زندگی، روح، نجات کا تصور وغیرہ عالم غیب سے متعلق ہیں، اور انسان ان عقائد کو اپنی بھلائی اور دکھ سے نجات کے لئے استعمال کرتا ہے، یہ شیطانی بھی ہو سکتے ہیں اور رحمانی بھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اصلی علم غیب خدا ہی دیتا ہے۔

۴۔ حکمت یا علوم کا عطر انسان فلسفہ یا حکمت کے ذریعے سے اپنے کل علوم (ہیئت، ریاضی، سائنس، حیاتیات وغیرہ) کی مدد سے ماہیت اشیا، ماہیت علم، اور وہ اصول یا اسباب معلوم کرنا چاہتا ہے جو بنیادی ہوں۔ مثلاً سچائی کی کیا حقیقت ہے۔ حسن وجمال کسے کہتے ہیں۔ خیر وشر کے کیا معنی ہیں۔ عدل وظلم کا انسانی سوسائٹی اور اس کی ذاتی زندگی میں کیا درجہ ہے۔ ان سوالات نے الٰہیات، نفسیات، منطق، اور علم الاخلاق کو پیدا کر دیا ہے۔ یہ سب علوم اگر نفسانی خواہشات پر قائم نہیں، بلکہ بے لوثی سے عام انسانیت کی فلاح کے لئے بذریعہ قلم حاصل کئے گئے ہیں تو یقیناً "رحمانی" (یا اچھے) ہیں (سورۃ العلق)

وجہ سے مٹ جاتی ہے، تو جان بھی باقی نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں مادہ ہی مادہ ہے اور جسے ہم روح یا جان کہتے ہیں وہ بھی مادہ کی ایک قسم ہے کوئی الگ شے نہیں ہے۔

جبر اس نظریئے کے ماننے والے کہتے ہیں کہ جس طرح حیوانات ونباتات فطری طور پر اپنے مخصوص اعمال کرنے پر مجبور ہیں، اسی طرح انسان بھی مجبور محض ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، ان مادی اجزائے ترکیبی کی وجہ سے کرتا ہے جو اس کے دماغ میں ایک مخصوص اندازے کے ساتھ ہیں اور مخصوص اعمال کے محرک ہوتے ہیں۔ گویا انسان بھی مادی چیزوں کی طرح اپنے اعمال میں مجبور محض ہے۔ یہ مادیت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

الحاد: چونکہ مادیت کسی قادر روح (یا مدبّر) کو تسلیم نہیں کرتی، اس لئے مادیت کا نتیجہ الحاد و انکار روح ہے۔

۳۔ امتزاج مادیت و روحانیت

عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مادہ اور روح دونوں موجود ہیں اور الگ الگ وجود رکھتے ہیں۔ روح مادّہ کے مقابلے میں زیادہ لطیف اور طاقتور ہے۔ بغیر روح کے مادہ میں حرکت و ترقی کا وجود نہیں پایا جاسکتا۔ جب روح کسی مادی جسم سے ملتی ہے تو اس میں مادہ کی صورت کے مطابق حرکت نمودار ہوتی ہے۔ حرکت کے ساتھ ساتھ ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ ارادہ اپنے مادّی جسم کی حدبندیوں سے محدود یا مجبور ہوتا ہے۔ یعنی ایک خاص حد تک ہی عمل کرسکتا ہے۔ لیکن ارادہ روح ہی میں پیدا ہوتا ہے اور اسی لئے روح مادّہ پر غالب ہے یا مادہ کی محرک ہے۔

جبر و اختیار: اس طرح روح میں ایک خاص حد تک اختیار بھی ہوتا ہے اور ایک حد تک اپنے مادی جسم کی وجہ سے مجبور بھی ہوتی ہے۔ لیکن روح کا جسم پر غلبہ ہوتا ہے گویا روح سوار ہے اور جسم گھوڑا ہے۔ گھوڑے کو

روح ہی اس قابل ہے کہ اسے روح کہا جائے اور باقی سب بے جان ہیں یا ایسی جان رکھتے ہیں جو اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچی اور ان کا شمار بھی مادہ ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ یعنی انسان ہی ایسی روح (یا شعور) رکھتا ہے کہ بھلے بُرے میں تمیز کر سکے اور دو راستوں میں سے اچھی راہ اختیار کر سکے یا بُری راہ۔ لیکن جانوروں اور پودوں وغیرہ کو اپنی راہ عمل اختیار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ جو راہ عمل فطرت نے ان کے لئے متعین کر دی ہے اسی پر مجبوراً چلیں۔ اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ دنیا میں روح ہی روح ہے، مادہ کی کوئی حقیقت نہیں، مادہ بھی روحانی تصور کا ایک کرشمہ ہے یا مادہ بھی خدا کی ایک شان ہے (وحدت وجود)

اختیار اس طرح صرف انسان، اور انسان بھی وہ جو عاقل و بالغ ہو اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پایا اور دنیا کا جتنا قانون انسانوں نے بنایا اس میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ صرف انسان میں اس درجے کی روح اور شعور موجود ہے کہ وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جوابدہ ہو

روح اعظم روح سے روح اعظم کا تصور پیدا ہوا جس کے متعلق بھی دو نظرئے بنے۔ یعنی (۱) دنیا میں روح ہی روح ہے یا (۲) روح مادّہ سے الگ ہے لیکن مادّہ پر حکمران ہے۔

۲۔ مادّیت بعض سوچنے والوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ روح کا انکار کر دیا اور کہا کہ مادّہ ہی سے ہر چیز بنتی ہے۔ یعنی جس طرح ستار کے تار سے آواز پیدا ہوتی ہے اُسی طرح جسے ہم جاندار کہتے ہیں، اُس کی جان اُس آواز کی مانند ہے جو لوہے کی اس شکل سے پیدا ہوتی ہے جسے ہم تار کہتے ہیں۔ اگر مختلف عناصر مادی ایک خاص شکل اختیار کریں اور ان میں خون (یا رس) دوڑنے کا ایک مادی نظام بن جائے تو یہی جان (یا آواز) ہے۔ جب عناصر کی یہ ترتیب مٹا دی جاتی ہے، یا کسی

گہرا ہے۔ اس سلسلہ میں جان لیوس اپنی کتاب مقدمہ فلسفہ کے صفحہ ۱۱ پر کہتا ہے کہ کسی عقیدہ کو لے لیجئے اور تحقیق کیجئے کہ کیوں آپ نے اسے مانا ہے:

"(۱) کیا محض اس لئے مان لیا کہ ہر شخص اسے مانتا ہے اور عام طور پر یہی مانا جاتا ہے؟

(۲) کیا پروپاگنڈا کرنے والوں نے آپ کو یہ بات منوا دی ہے اور مذہبی سند کی وجہ سے آپ نے یہ بات مان لی ہے؟

(۳) کیا اس کے متعلق دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ضرور سچ ہے؟ یعنی یہ عقیدہ حدس (INTUITION) پر مبنی ہے؟

(۴) کیا آپ اس پر اس لئے یقین رکھتے ہیں کہ اس طرح ماننے میں کام چل جاتا ہے اور انسان کی بھلائی کے لئے یہ عقیدہ ضروری معلوم ہوتا ہے؟

(۵) کیا یہ عقل (یعنی تجربہ) کی بنیادوں پر قائم ہے؟"

کاغذ کی ایجاد اور علم کو عام کرنے کی جو تحریک مسلمانوں نے شروع کی تھی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہسپانوی سلطنت کے ذریعے سے یورپ میں روشن خیالی شروع ہوئی، اور پادریوں ہی نے عوام کو علم سے آشنا کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ یورپ میں لاک، ہیوم اور کانٹ پیدا ہوئے جو کہتے تھے کہ کل علم تجربہ سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ ان کے ہمعصر بشپ بارکلے اور میل برانش یہ دعوے کرتے رہے کہ علم مافوق الفطرت طریقے سے حاصل ہوتا ہے مذہب کا یہ اثر تھا کہ "دے کارت کے پیرودں کے نزدیک صداقت کا معیار یہ تھا کہ وہ اسے بلا دلیل سچ مانتے تھے، اور درحقیقت جس چیز کو وہ "عقل بلا دلیل" کہتے تھے وہ صرف انجیل مقدس سے پوشیدہ قسم کی اپیل تھی، یعنی ان کا مقصد یہ تھا کہ پرانے عقائد کو کسی نہ کسی طرح نئے خیالات کے مطابق بنایا جائے" (اے۔ ڈبلو۔ بن کی ماڈرن فلاسفی)

ہم نے اوپر شق نمبر ۳ میں حدس کا ذکر کیا ہے لیکن سائنس کی دنیا میں،

سوار جدھر لے جانا چاہے لے جائے۔ اگر گڑھے میں گرائے گا، تو گھوڑا مرجائے گا، اور خود بھی اس شکل میں باقی نہ رہے گا۔ گویا اسے ہر اس قسم کے عمل کا اختیار ہے جو گھوڑا اپنے قویٰ کے ساتھ کرسکتا ہے۔ لیکن وہ چاہے کہ گھوڑا آسمان پر اُڑنے لگے تو چونکہ گھوڑا مجبور ہے اس لئے اس کا سوار اس سے یہ عمل نہیں کراسکتا۔ اس طرح روحانیت اور مادیت کے ملانے والے جبر واختیار کی بھی حد بندی کر دیتے ہیں۔ اور روح کو اس کے اعمال اختیاری کا جوابدہ مانتے ہیں۔ لیکن اسی حد تک جہاں تک کہ اس کی طاقت وبساط یا ارادہ سے کوئی فعل ہوا ہو۔

خالق کا تصور: روح اور مادّہ دونوں کو ماننے والے ایک ایسی روح کو بھی مانتے ہیں جو روح اور مادہ دونوں کی خالق ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور وہی خالق و قادر ہونے کی وجہ سے مختار کل بھی ہے۔ وہ جو چیز جس طرح کی چاہے بنائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تصور ہے کہ اُس نے کسی غرض و غایت سے ہر اچھی بُری چیز بنائی ہے۔ اچھائی یا بُرائی اس شئے کے مقصد سے متعلق ہوتی ہے۔ گو ہمارے افکار و خیالات اُسے اچھا یا بُرا بنا لیتے ہیں لیکن درحقیقت کوئی چیز فی نفسہ بُری یا اچھی نہیں ہوتی۔ چونکہ جو خالق و قادر ہے وہ نہایت ہی رحیم، حکیم، عادل و کارساز ہے، اس لئے وہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اُسے کسی نہ کسی بہتر مقصد کے لئے بناتا ہے۔

(نوٹ:۔ مادیت و روحانیت کے سلسلے میں سیرت محمد صلعم کی دوسری فصل بھی دیکھنا چاہیئے)

(ب) فلسفۂ علم یا نظریۂ علم

فلسفہ کا دوسرا مسئلہ ہمارے علم سے متعلق ہے۔ یعنی خود علم کیا ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ انسانی علم کا مسئلہ وجود کی ماہیت کے مسئلہ سے زیادہ

علم کا حاصل ہونا سمجھتے تھے۔ لیکن سب سے پہلے ابن رشد نے اور اس کے بعد سترھویں صدی میں لاک (۱۶۳۲-۱۷۰۴) نے "پیدائشی تصوّرات" کی مخالفت کی۔ اور موجودہ سائنس نے علت و معلول کا لزوم انسان کے دل میں تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر راسخ کر دیا۔ اور یہ نظریہ پیش کیا کہ غیب یا باطن کا علم روحانیت یا روحوں کے ذریعے نہیں، بلکہ مشاہدہ اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ بھی بتایا کہ جن تصوّرات کو ہم "پیدائشی تصورات" کہتے ہیں وہ بھی تجربے ہی کی پیداوار ہیں۔ یعنی ذریعۂ علم ہمارے حواس ہیں۔

یہ خیال کہ باطن یا غیب کا علم روحوں کو ہوتا ہے اور وہ ہمارے علم میں بذریعہ الہام لاتی ہیں، دنیا میں عام تھا۔ اور اسلام کے ظہور کے وقت عرب اس خیال سے مستثنیٰ نہ تھا۔

امتزاج الہام و مشاہدہ دنیا میں یہ خیال عام تھا کہ نجومیوں اور کاہنوں کو ستاروں اور جنوں سے تعلق ہے اور وہ چھپی ہوئی باتیں معلوم کر کے لوگوں کو بتا سکتے ہیں۔ وحی اول سے آپ کو معلوم ہوگا کہ آنحضرتؐ نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ چھپی ہوئی باتیں (غیب) کسی پر ظاہر ہو سکتی ہیں۔ البتہ آپؐ نے یہ فرمایا کہ نہ صرف علم غیب، بلکہ کل علم مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ علم خواہ محسوسات کا ہو (جو ہمارے ظاہری حواس سے حاصل ہوتا ہے) خواہ وہ غیر محسوس اور غیر معلوم باتوں سے متعلق ہو (جو ہمارے باطنی حواس سے ہمارے ادراک میں آتا ہے) یہ سب علم ظاہر و باطن اُن حواس و شعور سے حاصل ہوتا ہے جن کا خالق اللہ ہے۔ گویا حدس الہام یا وحی ایک قسم کے ذہنی یا روحانی مشاہدے کا نام ہے۔ موجودہ عہد کے سائنٹسٹ بھی مانتے ہیں کہ سائنس کی اکثر دریافتیں اسی قوت حدس یا الہام کی محتاج ہیں۔ اور اکثر پاکیزہ روح والے انسانوں کو خواب (رؤیا) اور بیداری (رائی) میں ایسی باتیں قبل از وقت بذریعہ حدس معلوم ہو جاتی ہیں، جن کا

جب تک عقل و تجربے کی کسوٹی پر کسی خیال کو نہ کسا جائے اُس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے مسلمانوں نے قرآن کی پیروی میں ہر جگہ "عقل و تدبر فی خلق اللہ" کو پیش نظر رکھا اور صرف حدس کی بنا پر کسی بات کو قبول نہیں کیا اور افلاطون و ارسطو کے مدرسوں کو جنھیں نصرانی شہنشاہ جسٹی نی ان نے ہزار سال تک بند کر رکھا تھا دوبارہ کھولا۔ پھر ابن رشد نے ارسطو کے تجربی فلسفہ میں نئے سرے سے جان ڈالی۔ گو ارسطو (۳۸۴۔ ۳۲۲ ق م) کا قول تھا کہ جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے وہ تجربے اور مشاہدے سے ہوتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے جن مضامین پر قلم اٹھایا ہے وہ سب اس کے تجربے پر مبنی تھے۔ مثلاً اس کی ہیئت محض خیال آرائی ہے اور حیاتیات بھی رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ اور چونکہ یونان میں غلامی کا عام رواج تھا اس لئے اس نے انسان کو آزاد اقتصادی انسان کے طور پر نہیں پہچانا بلکہ سکندر کی شہنشاہیت کا معمار بن کر دنیا میں انفرادیت اور یونانی آمریت کو چھوڑ گیا۔ لیکن اس نے یہ بڑا کام کیا کہ افلاطون (۴۲۷۔ ۳۴۷ ق م) کے عالم مثال یا عالم اشباہ کے دھوکے سے سمجھدار لوگوں کو بچا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ افلاطون کے زمانے میں ایتھنز کی سلطنت دم توڑ چکی تھی، افلاطون کو انسانی معاشرہ میں جو نقص نظر آتا تھا وہ اسے عالم شہود میں بھی نظر آنے لگا تھا لہٰذا اس نے یہ نظریہ بنایا تھا کہ عالم شہود کا کامل نقشہ ایک خیالی عالم میں ہے جسے وہ عالم مثال کہتا تھا اور محسوس دنیا کے نقص سے فرار ہو کر عالم مثال کے فرضی کمال میں پناہ لینا چاہتا تھا۔

سولھویں صدی مسیحی تک نصرانی کلیسا میں فلاطینوس (Plotinus) کا تصوف رائج ہو چکا تھا جسے نو افلاطونیت (افلاطونیۃ الحدیثہ) بھی کہتے تھے اور عقل و تجربہ کی جگہ ایک قسم کی روحانیت نے لے لی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ لوگ حدس اور الہام کے ذریعے سے یا روحانی طور پر کشف کے ذریعے سے

اسرار خدا را نہ تو دانی و نہ من
ویں حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوئے من و تو
چوں پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من

قرآن کی پہلی وحی ان ہی دو مسئلوں سے شروع ہوتی ہے، اور ان کی بنیاد پر جو فلسفۂ عمل بنا تی ہے وہ اسلام ہے۔ اس وحی نے جزم کے ساتھ نظریۂ وجود و نظریۂ علم کے متعلق ایک فیصلہ کن بات کہہ دی اور شک کی دنیا کو یقین سے بدل دیا۔ اسی لئے ہم نے اس پہلی وحی کو فاتحہ الکتاب، کنز، کافیہ اور شافیہ قرار دیا ہے۔ یہ زندگی کے دو بنیادی مسئلوں کو دو آنکھوں سے دیکھ کر ایک نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ یعنی وجود و علم کا فیضان اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

تعلق صرف ظاہری حواس کی کارفرمائی سے نہیں ہوتا۔

البتہ قرآن ان الہامات میں جو شیطنت کی طرف مائل کرتے ہیں، اور ان الہامات میں جو قوانین الہیہ کی طرف لے جاتے ہیں، یہ امتیاز کرتا ہے کہ شیطانی الہامات، شیطان کی طرف سے جن لاتے ہیں (جیسا کہ خود عرب کے کاہنوں شاعروں اور نجومیوں کا خیال تھا) اور رحمانی الہامات خدا کی طرف سے ملائکہ یا خدا کے ایلچی لاتے ہیں اور قلب انسان پر وحی کرتے ہیں۔

اس طرح آنحضرتؐ نے ایک طرف تجربہ و مشاہدہ یعنی سائنس کی اہمیت کو زیادہ کیا، دوسری طرف خود وحی و الہام کو خواص کا طریقہ علم بتا کر اسے بھی مشاہدہ (یا سائنس) کی ایک شاخ بنا دیا۔ البتہ معیار یہی رکھا کہ جس طرح سائنسی مشاہدہ حقیقت و صداقت کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح الہامی مشاہدہ بھی حقیقت کو واضح کرتا ہو۔ اگر ایسا نہ کرے تو وہ وسواس الخناس ہے۔ یعنی القائے شیطانی اور غیر سائنسی ہے۔

فلسفے کے دو بنیادی نظریئے

غرضکہ جب سے دنیا قائم ہے سوچنے والوں نے بیسیوں نظریئے بنائے اور ان نظریات کی روشنی میں زندگی کا حل ڈھونڈھا۔ اس طرح فلسفے کے دو بنیادی مسئلے بن گئے۔ (۱) یہ کائنات کیا ہے۔ اور (۲) علم و فہم انسانی کیا ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ پہلے کو نظریۂ وجود یا نظریہ ہستی (وجودیات) کہتے ہیں اور دوسرے کو نظریۂ معرفت یا نظریۂ علم (علمیات) مگر ہیں دونوں نظریئے۔ یعنی فلسفیوں نے ہستی اور علم کے متعلق مختلف اور بعض اوقات متضاد تصورات قائم کر لئے، اور حقیقت تک پہنچنے کا اب تک کسی نے دعوےٰ نہیں کیا۔ یعنی سیکڑوں سال پہلے ہم جس جگہ تھے آج بھی ان ہی گتھیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

بقول خیام ؎

دوسری ہستی (مثل شیطان یا وسوسۂ فاسدہ کے) ایسی نہیں ہے (جیساکہ پروہت و کاہن کہتے ہیں) جو سچا علم یا سچی خبر دے۔ سچے علم کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ علم رازمیں نہ رکھا جائے اور اس کو ذاتی منفعت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ بالفاظ دیگر سچا علم خدا کی طرف سے عام انسانی فلاح کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو علم بھی ہے وہ فریب دہی اور ذاتی نفع کا ذریعہ ہے اور یقیناً وسوسۂ شیطانی سے پیدا ہوتا ہے اور آخر کار معلم وشاگرد دونوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

نوٹ:- (۱) ابتدائی وحی میں جسے انسان کہا ہے، اُسی کو بعد میں آدم سے مخاطب کیا ہے۔

(۲) جس چیز کو اس وحی میں علم کہا ہے، اُسی کو بعد میں کتاب وحکمت بھی بتایا ہے۔

نظریات ہستی و علم اور پہلی وحی

مکہ سے تین چار میل دور ایک پہاڑی پر رمضان (دسمبر) کے مہینے میں رسول اللہ صلعم ہر سال تحنث یا بقول عینی شارح بخاری عبرت پذیری کے لئے جاتے تھے اور ایک ماہ غور و فکر اور تنسک میں بسر کیا کرتے تھے سنہ عام الفیل میں جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی، سترہ رمضان کی مبارک رات کو آپؐ نے عالم خواب میں محسوس کیا کہ آپ کا قلب ایک تصور سے منور ہو رہا ہے۔ اور کوئی طاقت آپ سے کہہ رہی ہے کہ زندگی کی جتنی پیچیدگیاں ہیں وہ ان دو حقیقتوں کی روشنی میں رفع ہو جاتی ہیں کہ

(۱) **حقیقت وجود یہ ہے** کہ ایک خالق ہے جس نے تجھے پیدا کیا ہے وہی تیرا رب (آقا) ہے۔ یعنی خالق و مخلوق الگ الگ وجود رکھتے ہیں اور روح و مادہ دونوں کا وجود خالق سے ہے۔

(۲) **حقیقت علم یہ ہے** کہ اس آقا نے قلم (یعنی تجربہ و مشاہدہ) کے ذریعے سے انسان (آدم) کو ان باتوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتا تھا (یعنی حیوان سے انسان بنا دیا اور عقل و ہوش عطا کیا تاکہ قلم سے اپنے علوم و تجربات کو ایک دوسرے تک پہنچائے اور ساحروں کی طرح شیطانی کام نہ کرے کہ ہر بات خفیہ اور راز ہو۔ اور یہ اس کی انتہائی مہربانی ہے کہ اس نے عقل و شعور بخشا جو انسان کا ذریعہ علم بنا۔ (وعلم آدم الاسماء کلھا)

ان دو حقیقتوں کے دو سلبی پہلو بھی ہیں یعنی :-

(۱) خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا یا آقا یا خالق نہیں ہے۔ وہ یکتا و یگانہ و بے مثال ہے۔

(۲) خدا اکرم ہے۔ یعنی دوسرے آقاؤں کی طرح ظالم یا خود غرض نہیں ہے اس کے کرم کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انسان کے نفع کے لئے اسے صاحب عقل و شعور بنایا اور اپنی بارگاہ سے علم عطا فرمایا۔ کوئی

جماعت کی میراث ہے۔ اور نہ تو دیوتاؤں کے خوش کرنے کا راز کسی غیر آدمی کو معلوم ہونا چاہیئے اور نہ اس فن کے استعمال کا کسی غیر پروہت کو حق ملنا چاہیئے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیوتاؤں کے نام پر نذر نیاز اور قربانیاں ہی نہیں وصول کی جاتی تھیں، بلکہ یہ کوشش بھی جاری تھی کہ لوگ قدامت پرست رہیں، اور علم و ہنر کی روشنی سے محروم رہ کر ذہنی اجارہ داروں کے غلام بنے رہیں۔ لطف یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس منظم مذہبی گروہ کے خلاف آواز بلند کرتا تھا تو پہلے تو سوسائٹی سے بے دین و کافر بنا کر نکال دیا جاتا تھا اور اگر پھر بھی باز نہ آتا تھا تو قتل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اگر کسی وجہ سے اس طرح کے "بے دینوں" کا مذہب ترقی پا جاتا تھا تو اس کے خلاف ایک مستقل محاذ بن جاتا تھا۔

یہودی اگرچہ تباہ حال تھے مگر ان میں متعدد فرقے بن گئے تھے اور خصوصیت سے صدوقی و فریسی بعث بعد الموت کے انکار و اقرار پر ایک دوسرے کو کافر بنا رہے تھے۔ یہی حال ہند میں تھا۔ بُدھ اور مہاویر نے جب برہمن سوسائٹی کے خلاف آواز بلند کی اور ویدوں کی بعض باتوں کو جھٹلایا، یا کہا کہ نہ زہد اور سنیاس سے نجات حاصل ہو سکتی ہے نہ بام مارگیوں کی طرح عیاشی و لذت پرستی سے کچھ ہو سکتا ہے بلکہ عقل کے بتائے ہوئے رستے پر اعتدال سے چل کر زندگی کا سوال حل کیا جا سکتا ہے تو خونی قربانیوں سے پیٹ بھرنے والوں نے سخت احتجاج کیا اور جب بدھ ست دھرمیوں (عقل پرستوں) کی کثرت کے آگے کچھ نہ چلی تو بدھ مذہب کو عوام سے دور کرنے کے لئے بدھ کی تعلیم کو عوامی زبان کی جگہ سنسکرت (خفیہ اور خاص زبان) میں منتقل کر دیا۔ تاکہ سمجھانے والے صرف پروہت رہ جائیں۔ پھر پورے ہند سے بدھ اور جین دھرم کا خاتمہ کر دیا۔ ایران قدیم میں بھی یہی ہوا کہ دو فرقے بن گئے اور ایک کے

سورۃ العلق کی پانچ آیتوں کے الفاظ کی تشریح

ہم نے قرآن کو ترتیب تنزیل کے ساتھ جمع کر لیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے وہ مفسر جو تفسیر بالرائے کرتے ہیں، یا کسی مفسّر بالرائے کی پیروی کرتے ہیں وہ بسا اوقات عربی الفاظ کے ان معنوں سے دور ہو جاتے ہیں جو آنحضرتؐ کے زمانے میں رائج تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم کے حقیقی و بنیادی خط و خال ان لوگوں کی آراء کے پردوں میں چھپ جاتے ہیں اور ان خام بنیادوں پر جن عقائد کی دیوار چُنی جاتی ہے وہ خطرناک ہو جاتی ہے اور نہ صرف معمار کو بلکہ اس مکان کے مکینوں کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔

انسان کی دینی اور تمدنی کشمکش: دنیا میں ہر قسم کے مذہب پھیل چکے تھے اور ہر مذہب میں متعدد فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کو اور ایک مذہب دوسرے مذہب کو مردود قرار دے رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہب عقل بھی اپنا کام کر رہا تھا، یعنی جنگ یا تجارت کے سلسلے میں جب ایک قوم دوسری قوم سے ملاقی ہوتی تھی تو ایک دوسرے کی بہت سی اچھی باتوں کو قبول کر لیا کرتی تھی اور اپنے قومی مذہب و تمدن کی عزت بھی یہ کہہ کر قائم کر لیا کرتی تھی کہ یہ بات ہمارے مذہب یا تمدن نے ہی دوسروں کو سکھائی ہے۔

توہمات اور شیطانی الہامات انسانی عقلوں پر پردہ ڈالنے والے گروہ، مذہب کی آڑ میں لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ یہ پروہت، ساحر، کاہن اور شاعر سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ علم و ادب، مذہب و عقل صرف ان کی

روح القدس تھا اور ماں مریم عذرا تھیں۔ ان کے خیال میں مسیح میں الوہیت کی کچھ صفتیں پائی جاتی تھیں۔ یہ نصرانی سب باتوں میں موسوی قانون یعنی توراۃ و شرع کے پیرو تھے۔ ان ہی کے مانند ابیونی تھے جو مسیح کو بہت بڑا پیغمبر اور انسان مانتے تھے۔ مریم سے پیدا ہونے والے مسیح کے وجود کے قائل نہ تھے یہ بھی کافر کردیئے گئے تھے اور عرب میں موجود تھے۔ ایک اور "کافر" فرقہ مریمی تھا جو مریم کو کنواری ماں کر کے انھیں بھی بجائے روح القدس کے خدا مانتا تھا۔ اس طرح ان کی تثلیث (باپ۔ بیٹا اور مریم) تین خداؤں کے اشتراک پر مشتمل تھی۔ غرضکہ نہ صرف تثلیث کو توحید ثابت کرنے اور تثلیث کے مختلف اقنوموں کی ماہیت معلوم کرنے کی کوشش جاری تھی، بلکہ جو شخص یا فرقہ ذرا بھی کلیسا کے پوپوں کے بنائے ہوئے عقیدہ سے منحرف ہوتا تھا وہ کافر و ملعون قرار دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ جو دلیلیں پیش کرتے تھے اور جس طرح تثلیث کو توحید کا رنگ دیتے تھے انھیں سن کر ایک بچہ بھی ہنس پڑے لیکن ان دلائل کو بزور شمشیر منوایا جاتا تھا۔ اور جان کے خوف سے ان کے خلاف کوئی ایک لفظ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس سلسلے کی ایک مثال درج ذیل ہے:

> "ہم دیکھتے ہیں کہ شیشے کے اندر سے روشنی یا نور گزر جاتا ہے اور شیشہ جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ چونکہ خدا نور ہے، اس کا نطفہ بھی نور ہے، اور جو چیز اس سے پیدا ہو وہ بھی نور ہے، اور خدا ہے جب مریم خدا کے نور سے حاملہ ہوئیں تو خدا کا بیٹا بھی نورانی شکل میں مریم کے پیٹ میں رہا۔ پھر جب پیدا ہوا تو نورانی شکل میں ظاہر ہوا اور مریم کنواری کی کنواری رہیں یعنی شعاع نور نے شیشہ بکارت کو بغیر توڑے ظہور کیا۔ یہ عقیدہ اب تک سپین کے رومن کیتھولک فرقے میں موجود ہے کہ مسیح نور ہیں اور مریم ام النور ہیں جو "باپ نور" سے پیدا ہوئے ہیں اور مریم پھر بھی کنواری ہیں۔"

خدا کو دوسرا فرقہ شیطان کہنے لگا۔ اسی لئے مزدا پرستوں کا آہورا ہند والوں کا آسورا (یعنی دیو) بن گیا۔ اور ان کا دیو ہند والوں کا خدا یا آسورا قرار پایا۔

جس طرح بدھ مذہب نے ہند میں سوشل انقلاب کی بنیاد رکھی تھی اسی طرح مزدک نے ایران میں کام شروع کیا تھا۔ وہاں بھی نتیجہ وہی ہوا کہ وہ، اور اس کے ساتھی زندہ درگور کردیے گئے۔ اسی طرح یہودیوں کی اصلاح کے لئے کئی پیغمبر پیدا ہوئے اور قتل کئے گئے۔ اور آخر کار مسیح کے ساتھ جو ہوا وہ دنیا پر روشن ہے۔

اگرچہ یہودیوں نے مسیح کو نہ مانا لیکن اسکندریہ کے فلسفیوں نے انھیں خدا بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فرقے جو مسیح کو خدا نہیں مانتے تھے مردود و ملعون قرار دیے گئے۔ مثلاً سابلی فرقہ کہتا تھا خدا تو ایک ہی ہے لیکن تثلیث کے تینوں عنصر اس کے تین اوصاف ہیں۔ آریوس مسیح کو خدا کا بیٹا تو مانتا تھا لیکن اصلی خدا یعنی "باپ خدا" کو زمانے کے اعتبار سے پہلے اور "بیٹے خدا" کو بعد کے زمانے کا تسلیم کرتا تھا۔ اس پر وہ کافر بنا دیا گیا۔ نسطوریوں کی ایک شاخ "یونی تی" تھی جو کہتی تھی کہ پیدا ہونے سے پہلے مسیح خدا تھا۔ لیکن جب اس نے اوتار کے طور پر دنیا میں جنم لیا تو وہ انسان بن گیا۔ نسطوری فرقہ کہتا تھا کہ مسیح کی فطرت دوگونہ ہے اس کی نیچر خدائی بھی ہے اور انسانی بھی۔ یعنی وہ آدمی ہے۔ وہ مریم کو خدا کی ماں نہ مانتا تھا بلکہ ایک انسان کی ماں سمجھتا تھا۔ یہ فرقہ شام، عرب اور عراق میں پھیلا ہوا تھا۔

یعقوبی بھی نسطوری تھے، یہ بھی عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ "یک آدمی" یعنی توحید جسم و روح کے ماننے والے (Mono physisist) کہتے تھے کہ خدا اور مسیح کی نیچر ایک ہی تھی۔ نصارٰی، جن کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے، عیسائیوں کے خاص فرقے یعنی "نصرانی" سے تعلق رکھتے تھے۔ درحقیقت یہ یہودی تھے۔ حضرت عیسٰے کو مسیح مانتے تھے اور کہتے تھے کہ مسیح کا باپ

ابوالحصین ۔ لومڑی	ابوالشیطان ۔ مرغ سحر	ابوالوقت ۔ عبقری
ابوالنوم ۔ افیون	ابوالنظارہ ۔ عینک لگانے والا	ابوتراب ۔ خاکسار حضرت علیؓ
ابوالہول ۔ مجسمہ مصری	ابولعبہ شکرؔ ۔ چمکدار چینی	

فارسی :۔

بچہ سگ ۔ پاجی ۔ احمق	پدرکش } پاجی	مادرزاد ۔ بیدائشی
بچہ لو ۔ کلی ۔ حادثہ	پدرسوختہ } پاجی	خاتون عرب ۔ کعبہ

انگریزی :۔

انسان کا بیٹا ۔ مسیح	شیطان کا بچہ ۔ پاجی	باپ کا ملک ۔ وطن
بیٹا ۔ مسیح	جہنم کا بچہ ۔ جہنمی	ماں کا ملک ۔ وطن
سفید مرغی کا بچہ ۔ خوش قسمت	بک بک کا بچہ ۔ وکیل ۔ بیرسٹر	کتیا کا بچہ ۔ حرامی
اپالو کا بیٹا ۔ پنڈت ۔ عالم	موم کا بچہ ۔ موچی	بندوق کا بچہ ۔ حرامی
مریخ کا بیٹا ۔ سپاہی	مقدس باپ ۔ پوپ	کنوارے کا بچہ ۔ حرامی

ہوا یہ کہ قدیم سامی زبانوں میں ابن اللہ اللہ والے یا اچھے آدمی کو کہتے تھے جیسا کہ ابن الشیطان بدمعاش کو اور ابن الحیّہ چالاک کو کہتے تھے ۔ جب اس لفظ کا یونانی بائبل والوں نے یونانی ترجمہ کیا تو بالکل لغوی کردیا اور اس کے مجازی معنی کو چھوڑ کر حقیقت میں اللہ کو باپ اور مسیح کو بیٹا اور ام مریم کو مسیح کی ماں نہیں بلکہ اللہ کی ماں قرار دے دیا۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ عرصہ دراز تک ایک مسیحی فرقہ دوسرے فرقے کو محض اس لئے کافر کہتا رہا کہ ایک حضرت مریم کو مسیح کی ماں کہتا تھا اور دوسرا اس بات پر زور دیتا تھا کہ مسیح انسان نہیں تھے بلکہ خدا کا نور تھے اور خدا تھے ۔ لہذا حضرت مریم کو خدا کی ماں نہ کہنا کفر ہے اسی لغوی ترجمہ

یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ مندرجہ بالا منطق ٹھیک ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ خدا کے باپ اور مریم کے ماں ہونے کا تصور کس غلط تعبیر سے ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کل زبانیں مجموعہ ہیں اُن الفاظ و محاورات کا جو مرورِ زمانہ کے بعد ایک خاص پہنچ اختیار کر لیتے ہیں اور ایسے معانی مستعار لے لیتے ہیں جو ان کے ابتدائی یا لغوی معنی نہیں ہوتے۔ مثلاً باپ اسے کہتے ہیں جو کسی بیٹے کو پیدا کرے اور اس بیٹے کی ماں کا شوہر ہو۔ بیٹا اسے کہتے ہیں جو باپ سے پیدا ہو اور اس سے سن میں چھوٹا ہو۔ اسی طرح بہت سے انسانی رشتے ہیں جن کے ہر زبان میں لغوی معنی کچھ اور، اور تشبیہ و استعارہ کے طور پر مجازی معنی کچھ اور ہیں۔ مثلاً

عربی : اِبن ۔ بِنت ۔ اَخ ۔ اُم ۔ اَبْ

ابن آدم ۔ انسان	بنت العین ۔ آنسو	اخوان الصفا ۔ پاک طینت
ابن الہلاک ۔ ملعون	بنت العنب ۔ شراب	اخی ۔ شوہر
ابن السبیل ۔ مسافر	بنت الفکر ۔ خیال	ام القُری ۔ مکہ
ابن آدمی ۔ گیدڑ	بنت الماء } جل پری	ام القِری ۔ آگ
ابن یومہ ۔ بے پرواہ	بنت البحر }	ام الراس = دماغ
بنو عم ۔ رشتہ دار	بنات الارض ۔ ندی	ام النور ۔ مریمؑ
بنو المدینہ ۔ شہری	بنات اللیل } افکار	ام النجوم ۔ کہکشاں
بنو اللیل ۔ چور	بنات الصدر }	ام عامر ۔ بجو
ابن الوقت ۔ خوشامدی	بنت النیل ۔ مصری عورت	ام الشی ۔ اصلہ
ابنائے جنس ۔ ہم جنس	بنت حوا ۔ عورت	ام الکتاب ۔ کلام الٰہی
ابنائے عصر ۔ ہم زمانہ	اخوالحزم ۔ محتاط آدمی	ابو جابر ۔ روٹی
بنت الشفہ ۔ کلمہ	اخوان الشیاطین ۔ بدمعاش	ابوالحارث ۔ شیر

معاشرت نے کن کن محاورات کو پیدا کیا تھا اور عربی زبان بولنے والے ان کا کیا مفہوم لیتے تھے۔ موجودہ عہد کی اصطلاحوں کو قدیم اصطلاحوں پر چسپاں کرنا ایک دام تزویر ہے جس سے ہر عقلمند انسان کو نکل جانا چاہیئے۔

اب ہم سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے چند الفاظ سے بحث کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کا سلفی مفہوم کیا تھا اور بعد میں آنے والوں نے ان کو کیا سے کیا کر دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ "ابن اللہ" کے لفظی ترجمہ کی طرح کسی اصطلاح کی خشت اول ہی کج رکھی گئی ہو اور ثریا تک دیواریں کجی باقی رہ گئی ہو۔

۱۔ اِقرأ سامی زبان کا لفظ ہے۔ اور چونکہ تمدن اور تحریر کو افریقہ اور یورپ تک فونیقی قوم نے پہنچایا جو سامی النسل تھی اس لئے یوروپین زبانوں میں بھی قرأ کا لفظ پہنچ گیا۔ ۸۰۰ ق۔م میں قرطاجنہ (Carthage) اور اس سے بہت پہلے طائر کا شہر تعمیر ہو چکا تھا۔ اسی فونیقی قوم نے یونانیوں کو ابجد سکھائی اور سیکڑوں سامی لفظ یورپ پہنچ گئے۔ فرانسیسی میں ایکرے (ECRE) لکھنے کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں کرائی (CRY) پکارنے یا چلانے کو کہتے ہیں۔ عبرانی میں تین معنی ہیں: پڑھنا یا بولنا، وعظ و نصیحت کرنا، اور عبادت یا پوجا کرنا۔ یہودیوں کے کاتبوں کو "قرائی" کہتے ہیں۔ اس لفظ کے ابتدائی معنی حمد و ثنا کرنا، یا وعظ و پند کے لئے زبان کھولنے کے ہیں۔ عربی میں اس کے معنی بولنے کے ہیں۔ (یہ ضروری نہیں کہ لکھی ہوئی چیز سامنے ہو اور اس کو پڑھے۔ لہٰذا اس کا ترجمہ پڑھنا بمعنی کسی لکھی ہوئی کے پڑھنے کے درست نہیں) سنسکرت میں کارو (گانے والا) کری (حفظ کرنے والا) کیرتی (شہرت دینا) کیرتن (کسی کی تعریفیں گانا) بھی قرأ سے مماثلت رکھتے ہیں۔ سورۃ العلق میں اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں یعنی بولو،

کی وجہ سے بال کی کھال نکالنے والوں نے اس مسئلہ کو بھی حل کرنے کی کوشش کی کہ بچہ ہونے کے بعد حضرت مریم کیونکر کنواری کی کنواری رہیں اور انھوں نے روشنی اور شیشہ کی مثال سے بزعم خود اسے حل بھی کر دیا.......... غرضکہ ایک محاورہ کے غلط ترجمے نے کروڑوں انسانوں کو ایک ایسے مغالطہ میں مبتلا کر دیا کہ یا تو وہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا ملحد ہو جاتے اور دین مسیح کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بار بار قرآن نے یہ بتایا ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم تھے، ابن اللہ بمعنی "خدا کا بیٹا" نہ تھے۔ اسی لئے جو لوگ اہل باطن یا اہل دل تھے۔ انہوں نے عوام الناس کی کفر سازی سے مجبور ہو کر حقیقت دین کو مجاز کا جامہ پہنا کر ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ شاید حافظ نے اسی لئے کہا تھا کہ:- ؎

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند   پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند
مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب   چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

یعنی مے نوشی وہ بے خودی پیدا کرتی ہے کہ جو لوگ دین کو دام تزویر بنائے ہوئے ہیں اُن سے انسان بے نیاز ہو جاتا ہے اور خود پرستی کے دھبوں کو ایک جرعہ سے اس طرح دھو دیتا ہے کہ ریا کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ حافظ نے جو بات کسی قدر الہامی زبان میں کہی تھی کہ ؎

حافظا می خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

اسے خیام نے زیادہ واضح کر دیا ؎

من بادہ خورم، ولیک مستی نکنم   الا بقدح دراز دستی نکنم
دانی غرضم زمے پرستی چہ بود؟   تا ہمچو تو۔ خویشتن پرستی نکنم

لہٰذا حقیقت قرآن تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ تمدن قبل اسلام کا مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس زمانے کی

سلطنت کرنے والے آقا کے بھی ہیں۔

عربی میں رب الفرس (گھوڑے کا مالک) رب البیت (مکان کا صاحب یا مالک) رب النوع (نوع کا آقا) عام طور پر مستعمل ہے اور ہر جگہ آقا، خواجہ، یا صاحب و مالک کے معنی مراد لئے جاتے ہیں۔

آقا کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مملوکہ شے کی تربیت بے غرضی سے کرے، اور اس کی نگہداشت میں صرف ملک یا عبد کی بھلائی پیش نظر رکھے اسی لئے جتنے آقا یا مالک ہوتے ہیں ان کو کسی حال میں اکرم نہیں کہا جا سکتا بہت ممکن ہے کہ وہ کریم ہوں لیکن بہرحال آقا بھی بے غرض نہیں ہو سکتا وہ اپنے عبد، یا گھوڑے، یا مکان کو بہتر حالت میں اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے فائدہ اور آرام حاصل کرے۔ کسی آقا یا رب کو بے غرض نہیں کہا جا سکتا البتہ اگر وہ اپنے عبد کو آزاد کردے، یا اس کے لئے آزادی کی کوشش کرے تو یقیناً وہ رب کریم و رحیم کہا جا سکتا ہے۔ البتہ صرف ایک آقا ایسا ہے جو اکرم ہے اور بے غرض ہے۔ وہ اللہ ہے۔

۳۔ خَلَقَ | (خَلْقًا وخِلْقَةً) = پیدا کرنا۔ کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا بنانا (بَرَأَ)۔ آفریدن و ساختن۔ نرم و ہموار کردن۔

خَلْقٌ :۔ مخلوقات۔ لوگ۔ مجمع۔ فطرت۔ ایجاد۔

بائبل کی پہلی کتاب (سفر) تخلیق کائنات کی کہانی تکوین سے شروع ہوتی ہے۔ اور بعد کی کتابوں میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں۔ خدا نے پہلے آسمان و زمین بنائے۔ پھر روشنی بنائی، اور خشکی سے تری (سمندر) کو الگ کیا۔ جس میں سبزی اور پھل کے درخت پیدا کئے۔ سورج۔ چاند۔ ستارے پیدا کئے تاکہ زمین پر روشنی ڈالیں۔ پھر مچھلیاں اور پرندے، درندے اور مویشی پیدا کئے اور اس کے بعد انسان کو اپنی مانند بنایا اور اسے ہر جاندار پر اقتدار عطا کیا۔ چھ دن میں تکوین کا کام پورا کرکے خدا نے ساتویں دن آرام کیا۔

یا حمد و وعظ کرو۔ بولو سے مراد یہ ہے کہ اسم رب سے بولنے کی ابتدا کرو۔ یعنی اللہ کے نام سے بولنا شروع کرو یا اپنے رب کے نام سے حمد و وعظ شروع کرو۔ اس طرح اقرأ باسم ربک کو الحمد للہ رب العٰلمین کا مترادف بھی کہہ سکتے ہیں اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی قرار دے سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم میں اس کا پورا مفہوم آجاتا ہے۔

۲۔ رب دنیا میں غلامی و خواجگی کا نہایت قدیم زمانے سے چلن تھا اس لئے عربی زبان میں بھی اس تصور کو ظاہر کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تھے۔ غلاموں کے آقا کو "رب" کہتے تھے۔ اس کا ایک ترجمہ "مالک" بھی تھا۔ اس لئے کہ غلام یا "عبد" رب کی نسبت سے عبد، اور مالک کی نسبت سے مملوک کہلاتا تھا۔ رب یا آقا کو عربی میں صاحب بھی کہتے تھے اسی طرح بابلی سامی زبان میں رب کو "بعل" بھی کہتے تھے۔ عربی میں "بعل" کے معنی شوہر، مالک اور آقا کے ہیں۔ قدیم بابلی و فونیقی اقوام بعل (سورج) اور اشتر (چاند) کی پرستش ہوتی تھی اور سورج یا البعل کو "رب السماوات" کہا جاتا تھا۔ بعل یا شمس پرستی یہودیوں میں بھی جاری تھی اور تاریخ یہود میں اسی بت پرستی کو زوال سلطنت یہود کی ایک وجہ بھی قرار دیا ہے (سلاطین باب ۲)۔ ایران میں بعل کو خورشید، ہند میں سوریہ اور رودی اور مصر میں را اور عزیرس کہتے تھے۔ اور اب تک پارسی، ہندو اور بعض یہودی (اسپینی) سوریہ (سورج) کی بندگی کرتے ہیں۔

رب، را۔ رودی، خور وغیرہ میں حرف "ر" پایا جاتا ہے۔ اور عربی فقہ اللغہ کے ماہر بتاتے ہیں کہ حرف "ر" جن لفظوں میں پایا جاتا ہے ان میں علو اور بلندی کے معنی ضرور ہوتے ہیں۔ اسی لئے رب کے معنی

کہ وہ صوری و معنوی حیثیت سے ترقی کرتی ہیں۔ الالہ الخلق والامر (اعراف ۵۴) سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔ پھر قرآن اس پر بھی زور دیتا ہے کہ مختلف انسانوں کی غیر علمی اور خرافات باتوں کو نہ مانو، بلکہ تجربہ و مشاہدہ کو دلیل راہ بناؤ۔ (ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض) سے اسی طرف اشارہ ہے۔

الذی خلق: خلق کرنے والا یا خالق۔ یہاں عام آقاؤں سے ممتاز کرنے کے لئے ایسی صفت بطور "فصل" کے بیان کی گئی ہے جو کسی دنیوی آقا میں نہیں پائی جاتی۔ اسی لئے الذی کے لفظ کا استعمال ہوا تاکہ جملہ زوردار بھی ہو جائے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ اور کوئی رب یا آقا نہیں ہے جو "خلق" کر سکے۔ پھر اس بات پر بھی زور ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے یہ دنیا خود بخود پیدا نہیں ہوئی بلکہ خلق کی گئی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ دنیا میں مادہ اور جاندار ترقی یا تنزل کر رہے ہیں یا نہیں۔ ارتقا کی بحث سے پہلے تخلیق کی بحث آتی ہے۔ اور صاف صاف جزم و یقین کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ایک خالق ہے جو مخلوق کو خلق کرتا ہے۔ اور یہ دنیا مشین کی طرح خود بخود نہیں چل رہی، بلکہ ایک خالق ہے جو کسی مقصد کے لئے اسے چلا رہا ہے۔ یعنی وحی اول کی پہلی ہی آیت نظریہ مشینیت (Mechanism) کی مخالف ہے۔ اور غایتیت (Teleology) کی تعلیم دیتی ہے۔

۴۔ انسان | انسان بر وزن فعلان اپنی اصل پر ہے۔ انس ضد ہے جن کا۔ اور انسی ضد ہے وحشی کا۔ اس کے معنی ہیں آدم یا بشر۔ آنکھ کی پتلی کو انسان العین کہتے ہیں۔ اس کی جمع اناس و اناسی ہے اس میں سے الف کو حذف کرکے اس کی جگہ "ال" لاتے ہیں۔ (انسان بمعنی آدم)

انسانیت کے عربی معنی مروت، مردمی، بہادری یا خوش اخلاقی و شرافت کے ہیں۔ گویا وہ آدمی جو محبت، بہادری، مروت و خوش اخلاقی

یورپین محققین کا خیال ہے کہ توراۃ کی کہانی، بابلی کہانی سے ماخوذ ہے (دیکھئے اس لینگڈن کی بابلی رزمنامۂ تکوین۔ آکسفورڈ ۱۹۲۳ء)۔ اور خود یہ کہانی اس سے پہلے کی سُمیری قوم کی کہانی سے لی گئی ہے۔ اس میں دیوتاؤں کی لڑائی۔ تخلیق کا کام اور پھر طوفان کا قصہ بہت کچھ تورانی کہانی سے ملتا جلتا ہے۔ یہ رزمنامہ نوروز بابلی میں پڑھا جاتا تھا اور اس کا بعد کے سامی مذاہب پر کافی اثر پڑا ہے۔

قرآن نے بائبل کو کتاب اللہ مانا۔ اور جزئیات توراۃ کی اکثر جگہ اصلاح کردی ہے۔ تخلیق کائنات کے سلسلے میں قرآن بائبل کے اس بیان کی پُرزور تائید کرتا ہے کہ کائنات اور انسان کا خالق اللہ ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ خدا کام کرتے کرتے تھک گیا۔ اور ساتویں دن اس نے آرام کیا اس سے انکار کرتا ہے۔ نہ وہ تورانی مدارج حیات پر زور دیتا ہے۔ وہ صرف اس بات میں توراۃ کی تائید کرتا ہے کہ خالق کائنات اللہ ہے۔ نہ یہ خود بخود پیدا ہوئی اور نہ کوئی دوسرا خالق اُس کا ہوسکتا ہے۔

ایرانی مذاہب میں، خصوصاً مذہب زرد اشتریں بھی اہورا مزدا خالق کائنات مانا گیا ہے اور قرآن کی طرح اسے پادشاہ (ملک) عالم غیب و شہود مانا ہے۔ اہورا کے معنی ہیں خداوند روح (حیات)، اور مزدا کے معنی ہیں دانا۔ یعنی خداوند بزرگ و دانا۔ اسی کو آفرینندۂ جہان بھی کہا ہے۔ گاتھا میں اسے "ہستی بخش" یعنی "خالق" اور ذات واجب الوجود یکتا اور منزہ از تعین مکان بتایا ہے۔

قرآن نے آگے چل کر اس بات کو بھی صاف کردیا ہے کہ وہی خالق جو کل عناصر کائنات کا خالق ہے۔ اس کا مدبر بھی ہے۔ اور درجہ بدرجہ ترقی دیتا ہے۔ اسی کو ارتقا بھی کہہ سکتے ہیں لیکن خلق اور ارتقاء دونوں کو چلانے والا وہی ہے۔ وہی ان عناصر و ارواح میں ایسی فطری استعدادیں دیتا ہے

بہترین لفظ کرم ہے۔

۷۔ **علم** ۔معرفت یا جاننے کو کہتے ہیں، جو جہل یا نا دانی کی ضد ہے اور علمی ضد ہے نظری کا۔ موجودہ زمانہ میں علم سائنس کو اور علمی سائنٹفک (SCIENTIFIC) کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے۔

علم ہی سے علامت کا لفظ ہے جس کے معنی اشارہ ہیں۔ گویا اس لفظ میں وحی و الہام کا اشارہ موجود ہے کہ حقیقی علم وادراک کا تعلق ذہن وحواس باطنی سے ہوتا ہے اور وہ علم ایک اشارہ خفی یعنی وحی و الہام کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔

وہ علم جو بذریعہ قلم خدا کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے وہی حقیقی علم ہے۔ دوسرے علوم (شعر و سحر و جوتش و کہانت) جو راز میں رکھے جاتے ہیں اور سائنٹفک تنقید کی کسوٹی پر نہیں کسے جاتے وہ سب شیطانی ہیں اور علم کی ضد یعنی جہل ہیں۔ قرآن کی یہ آیت انسان کو حقیقی علم کی طرف لے جا کر جہل و ظلم کی تاریکی سے نکالنا چاہتی ہے۔

آگے چل کر اسی علامت یا نشان کے لئے قرآن میں آیت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چونکہ علامت دلیل کو بھی کہتے ہیں اسی لئے آیت کے معنی بھی دلیل و برہان کے ہیں۔

علم کا تعلق قلم سے ہے اور قلم بھی علامات بناتا ہے، جن سے لوگوں پر خفیہ علوم آشکارا ہوتے ہیں اور وہ ہدایت پاتے ہیں۔

۸۔ **قلم** : قلم خامہ کو بھی کہتے ہیں جس سے لکھتے ہیں اور علامتیں یا نشان بناتے ہیں۔ یہاں لطیف اشارہ علامت و آیت سے ہے آیات اُن دلائل کو بھی کہتے ہیں جن سے ایک جاہل آدمی بھی "خالق کائنات" کو پہچان لے۔ گویا قلم بھی ایک ذریعہ وحی ہے۔ اور وحی خود آیات یا دلائل پر مبنی ہے جس سے انسان وجود حقیقی کی معرفت (علم) حاصل کرتا ہے۔

کی صفات رکھے وہ انسان کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ بقول غالب ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

۵۔ **علق :** کے معنی لگاؤ۔ محبت، انس، اور خون کی پھٹکی کے ہیں۔ اسی سے علوقہ کا لفظ بمعنی جونک کے ہے۔ رحم مادر میں نطفہ کی ابتدائی شکل ایک کیڑے کی سی ہوتی ہے جو ابتدا میں جونک کی شکل کا ہوتا ہے۔ موجودہ علم حیاتیات نے ثابت کر دیا ہے کہ جانوروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو انڈے سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو نطفہ یا علق سے رحم مادر میں پرورش پاتے ہیں اور ماں کا دودھ پیتے ہیں۔ اسی وجہ سے دودھ پلانے والے جانوروں کو اپنے بچے سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے۔ انڈے سے پیدا ہونے والے جانور نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات خود ماں اپنے انڈوں اور ننھے بچوں کو کھا جاتی ہے۔ غرضکہ علق اور انسان میں جو بلاغت ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے علق یعنی انس و محبت سے انسان کا خمیر بنایا۔ (بخلاف جان یا سانپ کے)

۶۔ **اکرم :** کریم کا صیغہ افضل التفضیل ہے۔ کرم، کرّم و اکرم۔ عزت دینا شرف بخشنا۔ کریم جوانمرد و فیاض کو کہتے ہیں۔ اس فیاضی و مہربانی میں رحم و بے غرضی داخل ہوتی ہے۔ اسی لئے کرم ایسی فیاضی کو کہتے ہیں جس میں شرافت پائی جائے اور دینے والے کو بدلے کی خواہش اور ضرورت دونوں نہ ہوں۔ حجر کریم قیمتی جواہر کو، کرم۔ انگور اور باغ کو، حصان کریم شریف النسل گھوڑے کو اور دم کریم شریف النسل انسان کو کہتے ہیں۔ وجہ کریم حسین و وجیہ چہرے کو اور الکریمتان آنکھوں کو بولتے ہیں۔ غرضکہ اس مادے سے جو لفظ بھی بنتے ہیں ان میں حسن و خوبی کی شان پائی جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اخلاق فاضلہ کے لئے

آیتوں کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتا رہا ہے۔ اصل حقیقت وہی رہی جو اس پیغام میں ہے۔ لہٰذا اگر ان آیتوں کو وہ خطابات دئے جائیں جو سورۃ الحمد کو دئے گئے ہیں (چونکہ حقیقت میں الفاتحۃ الکتاب یہی آیتیں ہیں) تو زیادہ مناسب اور برمحل ہوگا۔ اسی لئے ان کو الفاتحہ، کنز، کافیہ، شافیہ غرض کہ جو کچھ کہیں بجا ہے۔ تعلیم کے اعتبار سے یہ آیتیں اسلامی تعلیم میں مرکزی درجہ رکھتی ہیں گویا اسلام کی آنکھیں ہیں۔ اس لئے اسے "عنوان انقلاب" کہیں تو بجا ہے۔ اگر مولانا عبید اللہ سندھی نے سورۃ الفتح کا نام عنوان انقلاب نہ رکھ دیا ہوتا تو ہم اسے عنوان انقلاب کہتے۔

ان آیتوں میں زمانہ جاہلیہ کا پورا ذہنی پس منظر موجود ہے

جن دو باتوں پر ان ابتدائی پانچ آیتوں میں زور دیا گیا ہے وہ دو مرکزی یا بنیادی مابعد الطبیعاتی (یا الہیاتی) باتیں ہیں۔ جب سے انسانی سوچ بچار کی ابتدا ہوئی ہے ان ہی دو باتوں پر بحث جاری ہے، یعنی:

(۱) حقیقت وجود کیا ہے (وجودیات)

(۲) علم و فہم انسانی حقیقتاً کس طرح اور کہاں سے حاصل ہوتا ہے (علمیات)

سُورۃ العلق کی پہلی پانچ آیتوں کا مفہوم

(الف) پہلی آیت: اقرأ باسم ربك الذى خلق:

"اپنے اس آقا (رب) کے نام سے حمد یا وعظ و نصیحت (قرآت) بولنا شروع کر، جس نے کل کائنات کو خلق کیا ہے۔"

قرأ سے کسی چیز کو دیکھ کر پڑھنا مراد نہیں۔ اس کے معنی ہم لکھ چکے ہیں۔ حریر پر لکھے ہوئے الفاظ کا پڑھوانا، اور وہ بھی خدا کی طرف سے قطعی سمجھ میں نہیں آتا، جب کہ اللہ کو یہ علم تھا کہ آنحضرتؐ اُمّی تھے۔ نہ ہم

حروف مقطعات یعنی ابجد

ان آیات میں جن چند الفاظ کا استعمال ہوا ہے ان پر غور کیا جائے تو قرآن کریم کی وہ بحثیں جو عدم ترتیب تنزیلی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں وہ سب حل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً حروف مقطعات ہی ذریعۂ علم ہیں لہٰذا ذٰلک الکتاب یا تلک الآیات میں اشارہ ان ہی حروف ابجد کی طرف ہے جن سے علم حقیقی کے الفاظ و بیانات بنتے ہیں اور جو سحر کی طرح مبہم یا کہانت وغیرہ کی طرح شیطانی نہیں ہوتے۔ الم ذٰلک الکتاب اور الم تلک الآیات اور ن والقلم وما یسطرون میں جتنے حروف ابجد ہیں وہی ھدی للمتقین، آیات الکتاب اور کلام من عند اللہ ہیں۔ اسی لئے علم بالقلم یعنی علم مکتوبہ کو خدائی علم یا وحی کا درجہ دیا گیا۔

قرآن کی ابتدائی تعلیم ہی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے

یعنی سورہ ۹۶۔ العلق

اب ہم سورۃ العلق (۹۶) کی اُن پانچ آیتوں پر غور کرتے ہیں جن کے متعلق ہر محدث و مؤرخ بالاتفاق یہ کہتا ہے کہ یہی پانچ آیتیں ہیں جو سب سے پہلے رسول عربیؐ پر نازل ہوئی تھیں۔ لیکن یہ آیتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان پر محض سطحی طور پر گزرا جائے اور ترتیب مباحث قرآن کو نظر انداز کر دیا جائے۔

سورۂ علق کی پہلی پانچ آیتیں اُمّ القرآن ہیں

فرض کیجئے کہ اسلامی تعلیم صرف ان پانچ آیتوں تک محدود ہوتی، اور اس کے بعد رسول عربیؐ کے ذریعے سے انسان کو کوئی پیغام نہ دیا جاتا، تو کیا یہ اسلامی پیغام کو پورے طور پر دنیا والوں تک پہنچانے کے لئے کافی تھیں ہم کو یقین ہے کہ یہ آیتیں بالکل کافی تھیں، اور بعد میں جتنا قرآن نازل ہوا، ان ہی

انکار کیا اور اوّل الذکر نے خدا کا انکار اور آخر الذکر نے خدا کے متعلق خاموشی اختیار کی۔ یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ گوتم بُدھ نے خدا کے مفہوم کو دھرم (دین یا عدل یا فرض) کے لفظ سے ادا کیا۔ اسی کو ہندوؤں نے برہما (یا کلمہ) کہا تھا۔ یونانیوں نے لوگاس (کلمہ یا خیال) اور عربوں نے کلمہ یا حق کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔

پھر ربوں یا الٰہوں کی بہت سی قسمیں تھیں، اور تقسیم عمل کے خیال سے ایک ہی رب سب کام نہ کرتا تھا۔ یعنی پیدا کرنا، مارنا، پرورش کرنا مختلف ربوں کے اختیار میں مانا جاتا تھا۔ ان بڑے ربوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے رب بھی ہوتے تھے۔ کوئی بجلی گراتا تھا کوئی پانی برساتا تھا کوئی عشق کی دیوی تھی۔ کوئی دولت کی مالک تھی۔ غرضیکہ سیکڑوں قسم کے رب تھے۔

دنیا میں انسان بھی رب یا آقا تھا۔ وہ نہ صرف گھر بار۔ مال دولت بیل گھوڑے کا رب یا مالک ہوتا تھا۔ بلکہ اپنے ہی قسم کے انسانوں کا بھی آقا ہوتا تھا۔ اور انہیں جس طرح چاہے استعمال کرسکتا تھا۔ ان سب ربوں یا آقاؤں میں ایک وصف مشترک تھا کہ غلام انہیں ظالم سمجھتے تھے۔ اور یا تو ان کی غلامی سے قطعی آزاد ہو جانا چاہتے تھے یا انھیں بہترین خدمات پیش کر کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنا اور اپنی اولاد کا خون پیش کرنا ایک معمولی بات ہوگئی تھی۔ یعنی دیوتاؤں کو رشوت دے کر خوش کیا جاتا اور جا و بے جا کام لیا جاتا تھا۔

خدا موجود ہے

اس وحی میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ رب جو خالق ہے، دوسرے ارباب کی طرح نہیں ہے، جو خلق نہیں کرسکتے یعنی اس کی صفت خالقیت ہی بے مثال صفت ہے۔ اس وحی میں اس کے وجود کا صرف اقرار ہے، یعنی وہ رب موجود ہے، وہ ایک حقیقت ہے۔

ان روایتوں کو مان سکتے ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ نزول وحی کو آپؐ
تو نہیں سمجھے، یا سمجھے تو القائے شیطان سمجھے، اور حضرت خدیجہؓ نے
ورقہ بن نوفل نصرانی کے ذریعے آپؐ کو بتایا کہ یہ آسیب، جن یا
شیطان نہیں ہے بلکہ فرشتۂ وحی ہے جس نے آپؐ کو دبوچا، اور
باوجود اس علم کے کہ آپ پڑھنا نہیں جانتے تھے آپ کو پڑھنے پر
مجبور کیا۔ حالانکہ ان ہی راویوں کی روایت ہے کہ نزول وحی سے
پہلے شجر و حجر آپؐ کو نبی کہہ کر سلام کیا کرتے تھے۔

رب یا خالق کا تصور: ان پانچ آیتوں کا روئے سخن خود رسول عربیؐ کی طرف ہے۔ یعنی اس کلام کے دو متکلم
ہو سکتے ہیں ایک تو کوئی خارجی طاقت جو انسان کے دل میں خیالات و
تصورات پیدا کرتی ہے، دوسرے خود رسول عربیؐ اپنے نفس کو مخاطب
کر کے گفتگو کر رہے ہوں۔ دونوں صورتوں میں منشائے سخن ایک ہی ہے
یعنی خدا کا وہ تصور سامنے لایا جا رہا ہے، جو اس وقت تک عرب اور
ملحقہ متمدن ممالک میں عام نہ تھا۔ کہیں خدا کو خالق خیر، اور شیطان
کو خالق شر مانا گیا تھا (جیسے مجوسیوں میں) کہیں خدا کا اقرار تھا لیکن
مادہ کا انکار تھا، یا کم از کم مادہ کی ازلیت کا انکار تھا (ہندی ویدانت)
کہیں خدا اور مادہ دونوں ازلی قرار دئے گئے تھے یعنی دونوں غیر مخلوق
ہیں۔ کہیں خدا کو خالق اور مادہ کو مخلوق مانا گیا تھا۔ کہیں یا خالق
کا انکار تھا اور روح کو بھی مادہ کے امتزاج کا ایک نتیجہ سمجھا جاتا تھا،
جیسے چاروک ہندی (تیسری صدی مسیحی میں) یا دمقراطیس وامپیڈکلیس
یونانی یا موجودہ زمانے کے ملحدین یورپ۔ اور ہند میں جین مت کے
بانی مہابیر (۵۹۹-۵۲۷ ق م) اور گوتم بدھ نے (دونوں اگرچہ برہمن
نہ تھے بلکہ چھتری تھے۔) دونوں نے ویدوں کی بہت سی باتوں کا

پیدا کیا ہے، اُسی نے خیر و شر کو روشنی اور تاریکی عطا کی ہے یہ قدرتِ تخلیق کسی میں نہیں، لہٰذا وہی قادرِ مطلق ہے۔ یہ ہے اس بنیادی صفت کا تصور جو خدا کے متعلق محمد عربی ؐ کے دل میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔

اِس تصور کا نتیجہ "بغاوت"

(۱) حقیقی آقا یا رب وہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ دوسرے آقا یا رب مجازی ہیں۔ اور خود بھی مخلوق ہیں۔ جب صرف خدا خالق ہے اور سب مخلوق ہیں، تو انسان کو کسی دوسری مخلوق کے آگے سر جھکانے، یا اُس سے مدد مانگنے کی ضرورت نہیں۔ نہ اُسے ظالم سمجھ کر اس کے لئے قربانی پیش کرنے کی حاجت ہے گویا یہ تصور دوسرے ربوں اور خود اپنے نفسانی دیوتا (الٰہہ ھواہ) کے خلاف اعلانِ "بغاوت" ہے۔

(۲) جب کل انسانوں کا ایک ہی خالق ہے، تو مخلوق ہونے کی حیثیت سے سب انسان اُسی کے بندے ہیں، اور اس حیثیت سے سب برابر ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ خدا کے بندے کو اپنا بندہ یا غلام بنائے۔ ہر شخص کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اور ہر شخص کے حقوق مساوی ہونا چاہیئں۔

(۳) چونکہ ہر شے خدا کی پیدا کی ہوئی ہے لہٰذا ہر انسان بلکہ ہر جاندار کو حق ہے کہ ان سے پورا پورا اور حسب ضرورت فائدہ حاصل کرے۔ پانی اور ہوا، زمین و آسمان اور جتنی فطری پیداوار ہے وہ یکساں سب کے فائدے کے لئے ہے۔ جو اس اصول کو توڑتا ہے وہ "عدو اللہ" ہے۔

غرضکہ خدا کی خالقیت کا تصور انسان کی جسمانی غلامی کو توڑنے والا ہے۔ اور خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی بنیادی ضمانت ہے۔ دوسرے لفظوں میں بھوک اور خوف سے نجات حاصل کرکے فراغت و مسرت کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک ایسے رب (آقا) کی غلامی کا اقرار ضروری ہے، جو دوسرے آقاؤں کی طرح ظالم و خود غرض

آگے چل کر قرآن نے بتایا ہے کہ لیس کمثلہ شئ (اس کی مانند کوئی چیز نہیں ہے) لہذا اگر کوئی اس کی حقیقت کو جاننا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ ہمارے حواس نے اس کے مانند کسی چیز کا احساس نہیں کیا، لہذا قدرتی طور پر ہم ایسی ہستی کے تصوّر سے مجبور ہیں جس کو نہ محسوس کر سکتے ہیں، اور نہ اس کے مانند کسی چیز کو جانتے ہیں۔ وہ بے مثال، بے ہمتا اور یگانہ ہستی ہے۔ ہم اس کی ذات کے متعلق صرف اُن صفات سے اندازہ کر سکتے ہیں جو عالم محسوسات میں پائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیا ہے۔

وہی خالق ہے

ہم مادّہ سے مختلف چیزوں کو بنتے دیکھتے ہیں۔ بادل، درخت، پہاڑ، ستارے سب موجود ہیں، اور محسوس ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کبھی نہ کبھی بنے ہوں گے۔ کیا یہ خود بخود بن گئے؟ فلسفہ کا ایک مذہب جو مشینیت (Mechanism) کہا جاتا ہے وہ اس کا قائل ہے کہ ہاں یہ سب خود بخود بنے ہیں اور مشین کی طرح کسی علت سے چل رہے ہیں۔ فلسفہ کا دوسرا مذہب غائیت (Teleology) کہتا ہے کہ نہیں ہر شے کی غایت پر نظر ڈالنا ہے یعنی ہر چیز کسی نہ کسی مقصد سے کام کر رہی ہے محض مشین نہیں ہے کہ چلا دی گئی تو بلا غایت و مقصد کے چل رہی ہے۔ کوئی چلانے والا یا خالق ہے جو کسی مقصد کے لئے کل کائنات کو چلا رہا ہے۔

کسی چیز کو نیست سے ہست کرنے، یا عدم سے وجود میں لانے کی صفت کو خلق کرنا کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے اسی طرح اس صفت خالقیت میں یگانہ ہے۔ کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو عدم سے کسی شے کو وجود میں لا سکے۔ ہر چیز مخلوق ہے۔ صرف خدا خالق ہے۔ مخلوق اشیاء سے دوسری چیزیں تیار ہو سکتی ہیں۔ یہ تخلیق نہیں بلکہ صنعت ہے۔ صانع حقیقی یعنی خالق صرف خدا ہے۔ اُسی نے روح اور مادّہ دونوں کو

کہ "مجھے خدا کی طرف سے اس کا پکا ثبوت فراہم ہو چکا ہے، کہ وہی ہے جو انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔" خالق کو چھوڑ کر مخلوق کو پوجنا سراسر حماقت ہے:

پھر فرمایا: ھوالذی خلقکم من تراب،	اللہ نے تمہیں (۱) مٹی سے بنایا (۲) مٹی
ثم من نطفۃ، ثم من علقۃ،	سے نطفہ (۳) نطفہ سے جما ہوا خون،
ثم یخرجکم طفلا، ثم لتبلغوا	(۴) پھر بچہ بنا کر نکالا (۵) پھر مضبوط
اشدکم، ثم لتکونوا شیوخا۔۔۔۔	جوان کیا (۶) پھر بوڑھا۔۔۔۔۔ یعنی وہی
ھوالذی یحیی ویمیت	خدا ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔

سورۃ المؤمنون۔ رکوع ۱۔

سورۃ المؤمنون کا پہلا رکوع بھی علقۃ کی ناچیز ابتدا سے شروع کر کے خدا کی خالقیت کو دل نشین کرنے کے بعد اسی حقیقت کی طرف لے جاتا ہے، کہ وہی پیدا کرتا اور وہی مارتا ہے اور مرنے کے بعد پھر پیدا کرے گا۔ لہذا اس کے سوا کسی کی پرستش مناسب نہیں:۔

لقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین	ہم نے انسان (آدم) کو کیچڑ سے پیدا کیا
ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین	پھر ایک معین جگہ میں اس کے نطفے کو ڈالا۔
ثم خلقنا النطفۃ علقۃ ٥	پھر نطفہ کو جونک کی شکل کا کیڑا بنا دیا۔
فخلقنا العلقۃ المضغۃ ٥	اور اس جونک کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔
فخلقنا المضغۃ عظاما ٥	اور گوشت میں ہڈی پیدا کر دی۔
فکسونا العظام لحما ٥	پھر ہڈیوں پر گوشت بڑھایا۔
ثم انشأناہ خلقا آخر ٥	اور پھر نئی شکل میں اسے پیدا کر دیا۔
فتبارک اللہ احسن الخالقین	لہذا بڑائی ہو اس پیدا کرنے والے کی جو نہایت اچھا خالق ہے۔
ثم انکم بعد ذلک لمیتون	اس پیدائش کے بعد تم مر جاؤ گے۔
ثم انکم یوم القیمۃ تبعثون ٥	اور قیامت کے دن دوبارہ پیدا کئے جاؤ گے۔

نہیں ہے۔ وہ آقا وہی ہے جس نے پیدا کیا ہے۔ تیسری آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(ب) دوسری آیت خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ | اُس رب نے انسان جیسی ہستی کو جو ماحصل مخلوقات ہے علق سے بنایا۔

علق: اسی لفظ سے تعلق یعنی انس یا لگاؤ بھی ہے۔ یعنی جس طرح لفظ انسان میں اُنس یا محبت کا مادہ ہے اسی طرح اس علق یعنی خون کی پھٹکی کی پیدائش بھی اُنس و محبت کی دلیل ہے۔ لغت میں علوقہ جونک کو بھی کہتے ہیں یعنی وہ ننھا سا کیڑا جو بڑھ کر انسان کا بچّہ بن جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کی ابتدا ایک نہایت ناچیز خون کی بوند سے ہے، اسے اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سی ہستی ہے جس نے ایک معمولی قطرہ کو انسان بنا دیا۔ (انسان بمعنی آدمؑ یعنی ھوالذی خلقکم من تراب)

اس سورہ کے بعد کئی جگہ عَلَقَہ کا لفظ قرآن میں آیا ہے، اور ہر جگہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ وہی رب پرستش کے لائق ہے جس نے ایک ناچیز مشت خاک کو انسان بنا دیا۔ مثلاً

سُورۃ القیٰمہ۔ رکوع ۲:۔

الم یک نطفۃ من منیٍ یمنٰی ثم کان علقۃ۔ فخلق فسوی الیس ذٰلک بقادرٍ علٰی ان یحیی الموتیٰ ۝	کیا انسان منی کی ایک بوند نہ تھا جس کے بعد وہ جما ہوا خون بنایا گیا پھر اسے بنایا اور درست کیا۔ کیا وہ خدا جس نے پیدا کیا تھا اس پر قادر نہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد اُسے پھر زندہ کر دے۔

سُورۃ المؤمن۔ رکوع ۷:۔ پہلے قرآن نے رسول اللہؐ کی زبان سے کہا ہے کہ "مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو پوجوں اس لئے

اور اپنے غلاموں کو کم سے کم آرام پہنچاتا تھا، اُسی طرح یہ اَن دیکھے دیوتا اور شیاطین اپنے شفیعوں (یعنی پجاریوں) کے ذریعے سے اپنے بندوں کی کمائی کا بہترین حصہ وصول کر لیا کرتے تھے۔ اور چونکہ آقاؤں یا بادشاہوں کے خوش کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اس کو نذرانے پیش کئے جائیں، اس لئے دیوتاؤں کو خوش رکھنے اور اپنی مرادیں پوری کرانے کا طریقہ بھی یہی تھا کہ انھیں نذرانے اور خاص کر جانوروں کا خون اور گوشت پیش کیا جائے یہ چیز اُس زمانے کی یادگار ہے جبکہ انسان نے صحرا نوردی چھوڑ کر زراعتی زندگی میں قدم ہی رکھا تھا۔ اور یہ چیز اتنی عام ہو گئی تھی کہ لوگ اپنی اولاد کو بھی دیوتا کی خوشی پر قربان کر دیا کرتے تھے۔ غرضکہ مختلف قوموں کے دیوتا خونخوار، اور اُن کے بندے پجاریوں کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے اور عقل سے محروم تھے۔

عبادت کا دوسرا طریقہ تھا کہ یہ تصور عام کر دیا گیا تھا، کہ اگر ایک دیوتا انسان کو خوش نہ کر سکے اور باوجود قربانیوں کے اس کی مراد پوری نہ ہو سکے، تو وہ دوسرے دیوتا سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور جس طرح دنیا میں مختلف قسم کے راجہ یا فوجی سردار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور ایک دوسرے سے برسرِ جنگ رہتے ہیں اسی طرح دیوتاؤں میں بھی کشمکش جاری ہے۔ ہر قوم کے ایک نہیں، بلکہ گھر گھر دیوتا تھے پھر آسمان کے دیوتا الگ، زمین کے الگ، عورتوں کے الگ، جانوروں کے الگ، دولت کے الگ، جنگ کے الگ تھے۔ جسے خوش کرنا ہو اس کے پجاری کے ذریعے سے اس کو خوش کرو اور قربانی پیش کرو۔ ان دیوتاؤں کی بیبیاں بھی ہوتی تھیں، اور بچے بھی ہوتے تھے۔ غرضکہ ہر طرح سے پروہتوں کی اجارہ داری تھی، اور یہ پیشہ اتنا مفید تھا کہ اس کے راز سوائے مخصوص لوگوں کے اور کسی پر ظاہر کرنا جرم بنا دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ پجاریوں کی ذاتیں

نوٹ - عَلَقَہ بمعنی جونک یعنی چمٹ جانے والی چیز، اور علاقہ یا تعلق بمعنی لٹکانا، باندھنا، چپکنا، اُنس، سچی محبّت، جہیز، زندگی اور تجارت کے ہیں۔ ان سب سے محبت یا لگاؤ کا مفہوم ظاہر ہے۔ اسی لئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اُنس و محبت سے پیدا کیا۔

ایک سائنٹفک تحقیق یہ بھی ہے کہ انسانی نطفہ کی ابتدائی شکل ایک کیڑے کی سی بنتی ہے جو جونک کی شکل سے بڑھتے بڑھتے سانپ مینڈک اور پھر بندر کی شکل اختیار کرتا ہے اور کئی درجے طے کرنے کے بعد انسانی شکل ظاہر ہوتی ہے۔ اس ابتدائی کیڑے کی شکل علقہ (جونک) کی سی ہوتی ہے۔

(ج) تیسری آیت۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ : اے محمدؐ تو وعظ و نصیحت شروع کر دے اور یہ بیان کر کہ تیرا رب نہایت ہی کرم کرنے والا رب ہے۔

اَکْرَمْ : اب تک آقاؤں اور دیوتاؤں کا تصور یہ تھا کہ وہ ظالم ہوتے تھے اور واقعہ بھی یہ تھا کہ غلاموں کے آقا ان سے سخت سے سخت محنتیں لیتے تھے۔ اور نہ صرف ان کے جسم کو غلام بنائے ہوئے تھے بلکہ ان کے دماغ بھی غلام کر دیئے گئے تھے۔ وہ علم سے محروم رکھے جاتے تھے۔ اور اس محرومی کی وجہ سے مختلف ملکوں میں ایسی ذاتیں بن گئی تھیں جو نسلاً بعد نسلٍ غلام ہی رہتے تھے اور اپنے آقاؤں کے علاوہ پروہتوں اور پجاریوں کے بھی غلام ہوتے تھے۔ غرضکہ دنیا میں دوہری غلامی رائج تھی۔

اسلام سے پہلے عبادت کے جتنے طریقے رائج تھے ان کی بنیادیں دو چیزوں پر تھیں۔ اول یہ کہ جن دیوتاؤں کی پرستش کرائی جاتی تھی، وہ دنیاوی ربوں (آقاؤں) کی طرح اپنے عباد یا بندوں کی نظر میں نہایت خوفناک ہوتے تھے۔ جس طرح دنیاوی رب اُن کی محنت پر زندہ رہتا تھا

ذکر بھی اسی غرض سے کیا گیا ہے کہ انسان اپنی ایک نئی روحانی دُنیا بنائے جس میں ظلم و خوف کی جگہ رحم و محبّت قائم ہو۔ یہاں یہ نوٹ کرلینا چاہیئے کہ آنحضرتؐ سے پہلے دو انسان اور گزر چکے ہیں جنھوں نے قربانی اور مذہبی ذات کو مٹانے کی کوشش کی تھی یعنی گوتم بدھ اور عیسےٰؑ بن مریم۔ دونوں نے رحم و محبّت کا پیغام اپنے اپنے زمانے کے پجاریوں اور ربیوں کی قربانیوں کے خلاف دیا تھا، لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ان دونوں مذاہب کی بنیادی تعلیم مسخ ہو گئی اور ان پر عمل ناممکن کر دیا گیا۔ قربانی پھر رائج ہو گئی۔ اور ذاتیں پھر بن گئیں۔ مسیحؑ سے چھ سو برس پہلے جو پیغام بدھ نے دیا اس کو عملی جامہ محمدؐ عربی نے کس طریقے سے پہنایا، یہ چیز ہم قرآن و سیرت سے ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ بہرحال پہلی وحی اس بات پر زور دیتی ہے کہ خدا اکرم ہے، اور دوسروں کے پاس دست طلب پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ نہ قربانی کی ضرورت ہے نہ پجاری کی۔

(د) چوتھی آیت۔ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمْ: اس خدا کا یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ وہ علم قلم کے ذریعے سے دیتا ہے۔ یعنی وہی علیم ہے۔ نہ یہ پجاری علم رکھتے ہیں نہ اُن کے دیوتا اور شیطان۔

سچّا علم اور وہمی عقیدہ: موجودہ زمانے میں علم کی آزادی کی وجہ سے جو ترقی ہوئی ہے اس سے علمی اصطلاحات زیادہ واضح اور روشن ہو گئی ہیں۔ امام ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے زمانے میں ابن عربی کے فلسفہ کی مدد سے اصطلاحات کو نہایت صاف اور آسان بنا دیا تھا۔ ضرورت ہے کہ اب ہم ان قدیم اصطلاحات کو نئے علوم کی روشنی میں دوبارہ سمجھیں اور ان کی موجودہ شکلوں کو پہچانیں۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں علم کی صحیح تقسیم یہی ہو سکتی ہے جو قرآن کی

بن گئی تھیں اور صرف اُن کی اولاد ہی کو یہ حق تھا کہ وہ دیوتاؤں کے خوش کرنے کے راز اور اُن کے منتروں سے واقف ہوں۔ ایران میں موبد دستور ہند میں برہمن، اور عرب میں سدنہ قریش کی اجارہ داری مذہب و عقل پر چھائی ہوئی تھی۔ مصر میں بھی یہی حال تھا اور قدیم سوسائٹی میں تو قدرت کا ہر قانون جو کسی کو معلوم ہو جاتا تھا وہ اسے اپنے نفع کے لئے حتی الامکان راز ہی میں رکھتا تھا۔ غرضکہ پوجاریوں، ساحروں اور ساحر طبیبوں کی خود غرضی اور حرص نے لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ یہ بھی بنالیا تھا کہ اگر ایک قسم کے دیوتا سے کام نہیں چلتا تو سینکڑوں دوسرے قسم کے اور دوسری صفات کے دیوتا، ان کی مائیں اور بیویاں موجود تھیں، جو لوگوں کو اپنے جال میں پھنسائے ہوئے تھیں۔ دیوتاؤں یا معبودوں کی کثرت کی ذمّہ داری عوام پر نہ تھی، اس کی ذمہ داری پوجا کرانے والی جماعت پر تھی جو لوگوں کو اندھا بنائے ہوئی تھی۔ اور اکثر پوجا یا سحر کے کسی راز کا اتفاقیہ انکشاف، غیر پجاری کے لئے قتل کا پیغام ہوتا تھا۔

اس پس منظر میں آپ دیکھئے کہ خدا کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اکرم ہے کیا کیا معانی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ خدا خونخوار خدا نہیں ہے، جو قربانی کے خون اور گوشت سے خوش ہوتا ہو، دوسرے یہ کہ جب وہ سب سے زیادہ کریم ہے تو متعدّد اور مختلف دیوتاؤں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مذہبی اجارہ داروں یعنی پجاریوں اور سادنوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہر شخص اپنے اکرم خدا سے براہ راست جو چاہے مانگ سکتا ہے، شفیع یا پجاری کی ضرورت نہیں ہے۔

اس پہلی وحی میں خدا کی کریمی پر جو زور دیا گیا ہے وہ اسی لئے کہ لوگ دوسرے دیوتاؤں کی طرح اُسے بھی خونخوار نہ سمجھیں بلکہ رحم و کرم کا سرچشمہ جانیں۔ اس سے پہلی آیت میں "علق" یا "محبّت" و "انس" کا

آگر تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ اس کو ایسی عقل سلیم، اور قوت مشاہدہ عطا فرماتا ہے جس سے وہ اپنے تجربوں سے فائدہ حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور پھر ان کو لکھ کر دوسروں تک پہنچانے کا سامان بھی کر سکتا ہے۔

یہاں دو باتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ خدا خالق انسان ہے اسی نے آدم کے حواس اور عقل کی قوت کو بھی خلق کیا ہے۔ اور اس لئے کیا ہے کہ وہ ان کے ذریعے سے علم حاصل کر سکے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ خدائی علم اور شیطانی علم کا فرق بتایا گیا ہے۔ خدائی علم وہ ہے جو قلم کے ذریعے سے ہر انسان تک پہنچ سکے، خواہ وہ مکانی فاصلے پر ہو یا زمانی فاصلے پر، بخلاف اس کے شیطانی علم (اگر اسے علم کہا جا سکے) وہ علم ہے جو محض ایک جماعت تک محدود ہوتا ہے۔ نہ قلم کے علم کی طرح اس کے کلمات اور معانی واضح (ع.ی) ہوتے ہیں۔ نہ وہ عام فائدے کے لئے ہوتا ہے نہ وہ علم تجربہ اور مشاہدہ کے حقائق کو بیان کرتا ہے، بلکہ وہ علم یا تو ستاروں کو دیکھ کر، یا پانسے پھینک کر، یا جنوں اور شیطانوں کے نام پر حاصل کیا جاتا ہے، اور تنقید کی کسوٹی پر برسرِ عام، قلم کے ذریعے سے نہیں لایا جاتا، اس لئے کہ نہ تو اس کہانت (سحر) کے الفاظ کے کچھ معنی ہوتے ہیں اور نہ وہ اس لئے ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ اس کو جانیں اور خود استعمال کر سکیں۔ وہ ابتدا ہی سے بے معنی اور مہمل لفظوں کا مجموعہ ہوتا ہے تاکہ جاہل اور خائف انسان ان ساحروں اور کاہنوں کے جال میں پھنسا رہے اور اپنی ہر عزیز چیز ان کے حرص و آز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتا رہے۔

علم اور اختیار:۔ آئندہ چل کر قرآن میں اکثر جگہ "کتاب" اور "اہل کتاب" کا ذکر آیا ہے۔ کتاب کے معنی بھی علم کے ہیں "اہل کتاب" اہل علم اور متمدن و مہذب عقلمند لوگوں کو کہا گیا ہے۔

پہلی وحی نے بتائی ہے۔ یعنی وہ عقائد جو توہمات اور مفروضات سے پیدا ہوں وہ شیطانی ہیں اور حقیقی علم سے بہت دور ہیں۔ حقیقی علم یا سچا علم قلم یعنی عقل و تجربے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ عقل و تجربے کی قوت خدا دیتا ہے اور وہی سچا علم ہے۔ بالفاظ دیگر وہ علوم جنھیں ہم آج کل سائنس کہتے ہیں وہ خدائی تعلیم ہے۔ سائنس مادیات ہی کا مشاہدہ نہیں کرتی بلکہ سوچنے اور سمجھنے کے اصولوں (منطق) انسانی عمل و کردار، علم الاخلاق کے قاعدوں نفس و شعوری زندگی (علم النفس)، اور ماورائے مادہ تصورات (مابعد الطبیعات) کی حقیقت پر بھی غور کرتی ہے اور تجربے، مشاہدے اور مقابلے کے بعد چند اصول بناتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جو لوگ بلا سوچے سمجھے یا غلط طریقے پر سوچ سمجھ کر بعض اصول بنا لیتے ہیں، یا دوسروں سے سُن سُنا کر، بغیر کسی بات کو پرکھے ہوئے یہ مان لیتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے، وہ غلط راستے یا غلط عقیدے پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اسی کو توہم پرستی اور غلط اندیشی کہا جاتا ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں اس طرح کا علم شیطانی علم ہے جو قلم یعنی عقل و تجربے سے حاصل نہیں ہوا۔ من اتخذ الٰہہ ھواہ اور وسواس الخناس ہی کا نام شیطان پرستی اور جہل بمقابلہ علم یا کتاب یا وحی کے ہے۔

(نوٹ۔ فلسفہ سانکھیا (ہند) (جس پر بُدھ مت کی بنیاد ہے) کے مطابق علم ہی نیکی ہے اور چونکہ مادی کائنات میں حرکت ہے، شعور و آگہی نہیں ہے بخلاف اس کے روح میں شعور ہے حرکت نہیں ہے۔ اس لئے روح اور مادہ دونوں ایک دوسرے کی مدد سے کام کرتے ہیں۔ اور علم کے ذریعے سے روح مادّہ کی حاکم بن جاتی ہے اور آخر کار نیکی کے علم سے وہ نجات حاصل کر لیتی ہے۔)

ذریعۂ علم قلم ہے : قلم وہ آلہ ہے جس کے ذریعے سے انسان اُس علم کو جو خدا دیتا ہے، قلم بند کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا براہ راست کسی کو

وہ شرک ہے۔ قرآن کے سامنے خدا کا واحد اور یکتا ہونا اتنا بدیہی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی عالمگیر قدرت میں دوسری طاقت کو شریک بنائے جس نے کائنات کو خلق کیا ہے، تو یہ نا قابل معافی جرم ہے۔

(۵) پانچویں آیت۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ اس مہربان خدا نے یہ کتنی بڑی مہربانی کی ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہر انسان کے لئے علم کا راستہ کھول رکھا ہے۔ جن باتوں کا علم انسان کو نہیں ہوتا وہ خدا ہی دیتا ہے۔ یعنی قدرت کے راز جو انسان کی نظر سے پوشیدہ ہیں وہ خدا ہی حسب موقع و زمانہ ظاہر کرتا رہتا ہے۔ اور اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ساحر و کاہن سچ کہتے ہیں کہ جن و شیطان انھیں علم دیتے ہیں، تو بھی وہ علم خدائی علم کا مقابل و مماثل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لئے شیطانی علم تو صرف پجاریوں اور ساحروں تک محدود ہے، خدائی علم ہر انسان کے لئے جو اس کا بندہ ہے، عام ہے۔ اور جو علوم الٰہیہ کو راز میں رکھے وہ بندۂ شیطان ہے۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیتوں کا ایک ہی قافیہ ہے اور یہ تینوں ایک ہی مضمون یعنی علم، ذریعۂ علم، اور مہبط علم سے بحث کرتی ہیں ماحصل ان کا یہ ہے، کہ جس طرح خدا ہی خالق ہے اسی طرح صرف وہی علیم ہے۔ اور باوجودیکہ وہی رب یا آقا ہے، وہ نہ تو علم کو کسی ذات تک محدود رکھتا ہے، نہ اپنی مخلوق انسانیت میں کسی کو آقا اور غلام قرار دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی نعمت یعنی علم سب کے لئے مساوی طور پر عام ہے۔ اور یہی اس کا سب سے بڑا اکرم ہے کہ انسان جسمانی اور دماغی طور پر پورا پورا آزاد ہو، قدرت کے عطیوں سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھائے، اور جو لوگ اس راہ میں

اس کے مقابلہ میں اُمی کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی وہ لوگ جو تمدن، قانون وعلم سے بہرہ ور نہیں ہوئے، یا اپنی فطری حالت میں بغیر کسی قانون حیات (کتاب) کے زندگی بسر کرتے ہیں۔

البتہ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں، جو عالم ہونے کے مدعی ہیں، لیکن اپنے شیطانی علم (سحر، شعر، کہانت) کو راز میں رکھتے ہیں۔ اور سچے علم کتاب کی طرح علانیہ (لسان عربی مبین میں) دوسروں کو نہیں پہنچاتے۔ یہ لوگ درحقیقت شیطانی ایجنٹ ہیں اور ان کا علم محض فریب اور روٹی کمانے کا ذریعہ ہے اسی لئے قرآن نے آئندہ بار بار کہا ہے کہ قرآنی تعلیم کے لئے کسی اجرت یا معاوضہ کی خواہش رسول عربی کو نہیں (ان اجری علے اللہ)

گویا قلم کے معنی نہ صرف علم کے ہیں بلکہ اچھے علم کے ہیں۔ ایسا علم جو اہل عقل (اولی الالباب) خدا کی دی ہوئی عقل سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر انھیں اس بات کی بھی آزادی ہے کہ اپنی عقل سے حاصل کئے ہوئے علم پر عمل کریں یا نہ کریں یہ رب کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ اس نے انسان کو مشعل علم و عقل عطا کی اور اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ اندھوں کی طرح چلیں یا جانوروں کی طرح صرف اپنے انسٹنکٹ کی پیروی کریں۔ انھیں عقل دینے کے باوجود با اختیار بنایا۔ چاہیں تو وہ سیدھی راہ پر چل کر منزل تک پہنچیں، اور چاہیں تو ٹیڑھی راہ اختیار کر کے گڑھے میں گر جائیں۔

آئندہ چل کر جب یوم الدین یعنی جزا و سزا کے دن کا تذکرہ کیا ہے تو اس وقت بھی یہ آیتیں پیش نظر تھیں کہ خدا اکرم ہے۔ لہذا یہ کہہ دیا گیا، کہ اللہ عادل تو ہے ہی، وہ انصاف کے دن یعنی قیامت میں لوگوں کے اعمال کے مطابق انھیں جزا و سزا دے گا۔ لیکن ان فیصلوں میں بھی اس کا رحم و کرم شامل رہے گا۔ اور وہ جس کمزوری یا گناہ کو چاہے گا معاف کر دے گا۔ البتہ ایک گناہ جس کے لئے کم عقلی یا کم علمی یا مجبوری کی معذرت قبول نہ ہوگی

پہلی وحی کے اجمال کی تفصیل

یہ وحی گویا وہ پیغام ہے جو آنحضرت ﷺ کے تحنث کے نتیجے میں خدا نے آپ ﷺ کے دل پر نازل کیا یہی پیغام اسلام کا بنیادی پیغام بنا۔ بعد کا قرآن صرف اس مختصر مگر جامع پیغام کی تفصیل ہے۔

۱۔ خدا خالق ہے: بانی کائنات مخلوق ہے، اسی خالق نے انسان کو پیدا کیا ہے، جو حاصل کائنات ہے۔ (یعنی روح اور مادہ الگ ہیں اور خالق و مخلوق بھی ایک نہیں ہے۔ لیکن اُنس یا محبت روح و مادہ میں ایک کڑی ہے)

۲۔ علم کا ذریعہ عقل ہے: عقل خدا نے بخشی ہے۔ عقل (یعنی قلم) کے ذریعے سے انسان کی ہدایت خدا ہی کرتا ہے۔ کوئی دوسری طاقت نہ علیم ہے نہ علم دے سکتی ہے۔ خدا ہی عقل حواس کے ذریعے سے انسان کو علم دیتا ہے۔ کوئی اور طاقت (مثلاً شیطان وغیرہ) نہ علم رکھتی ہے نہ دے سکتی ہے۔ عقل کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے نہ چلنے کی آزادی بھی خدا نے دے دی ہے۔

نتیجہ: جسمانی و ذہنی آزادی و مساوات: (۱) جب سب انسانوں کا خالق خدا ہے، تو سب انسان بندہ ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ غلام و آقا فقیر و امیر وغیرہ کے امتیازات انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ خدا کی طرف سے سب کو جسمانی و ذہنی آزادی دی گئی ہے۔

(۲) خدا نے سب انسانوں کو عقلی صلاحیتیں دی ہیں، ان کو ایک چالاک گروہ نے اپنے فائدے کے لئے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اس سے

ارباب من دون اللہ بن کر حائل ہوں، ان کے خلاف اعلان بغاوت کر دے۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ہ

عَلَّمَ اٰدَمَ اَسْمَآءَ کُلَّهَا۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

آدم یعنی انسان کو جو کچھ سچا علم ملتا ہے وہ خدا ہی دیتا ہے شیطان کی رسائی حقیقی علم تک نہیں ہے۔

مقصد یہ ہے کہ خدائی علم اور خدا کا علم دونوں اولاد آدم کو غیر اللہ سے بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں۔ رسول عربی صلعم نے گونگوں کو زبان عطا کی مجبور غلاموں کو بغاوت کی تلوار دی اور انسانیت کو حقیقی آزادی کا مطلب اس طرح سمجھایا کہ اللہ کا نام لے کر کل شیطانی نظاموں کو توڑ دیں۔

بہر حال قرآن کی یہ بنیادی تعلیم ہے کہ یہ جو غیب کے علم کے دعویدار کاہن و ساحر بنے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنوں، شیطانوں، ستاروں یا فال وغیرہ کے ذریعے سے وہ چھپی ہوئی باتوں کا علم حاصل کرتے ہیں یہ سراسر غلط دعویٰ ہے۔ وہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ مقصد اُن کا یہ ہے کہ انسانی عقل و شعور کو اپنا غلام بنائے رکھیں اور ان ذہنی غلاموں کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالیں۔ اس قسم کی جماعتیں انسانیت کی دشمن ہیں، ان کو مٹا کر ہی عقل انسانی آزادی کی صراط مستقیم پر چل سکتی ہے۔

اور شیطانی رازوں کو جان سکے جب تک کہ شیطان کی پرستش نہ کرے۔ بعض کا خیال تھا کہ (مثلاً نصاریٰ و مجوس) خدا کی حکومت آسمان پر ہے اور اس دنیا میں شیطان کی حکومت ہے۔

جو لوگ خدا کے منکر تھے، وہ روح کے بھی منکر تھے، اور مرنے کے بعد روح کی بقا کے خیال کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور وہ جو دو خداؤں یعنی شیطان و یزداں کے قائل تھے انھیں بھی بعث بعد الموت کی پرواہ نہ تھی اور وہ بھی یزدان کو ملک یوم الدین نہیں مانتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ ہماری دیویاں اور شیاطین خدا کے رشتہ دار ہیں۔ وہ یزدان سے سفارش کر کے ہماری بداعمالیوں کو معاف کرا سکتی ہیں۔ لہٰذا ان کے سامنے بھی بعث بعد الموت کا کوئی واضح خیال نہ تھا۔ خود یہودیت میں بعث بعد الموت کا تصوّر توریت میں نہیں ہے۔ اس لئے جب قرآن نے یہ کہا کہ خدا خالقِ کل ہے، تو اس سے یہ بھی ثابت کیا کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ کر سکتا ہے۔ اور ظالموں کو سزا، اور صالحین کو جزا دے سکتا ہے۔

خدا خالق ہے نہ علیم

کفارِ مکہ نے ان دونوں باتوں سے صاف انکار کر دیا اس لئے کہ (۱) خدا کو خالق ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے ایک ایسی طاقت کو مانے جو مردہ کو زندہ کر سکتی ہے، اور مرنے کے بعد بھی نیک و بد اعمال کی جزا و سزا دے سکتی ہے۔ لہٰذا قرآن کے آئندہ بیانات سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے سرے سے خدا ہی کا انکار کر دیا، اور جنھوں نے انکار نہیں کیا وہ خدا کا ہمسر شیطان کو ماننے لگے۔

(۲) خدا کو علیم ماننے میں ان کا ذریعہ معاش ختم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ انھوں نے ایک پجاریوں اور کاہنوں کی جماعت بنا رکھی تھی جو شیطانوں اور جنوں کے ذریعے سے علم و سحر و شعر حاصل کرنے کی دعوے دار تھی اور

آزاد ہونے کے لئے انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ علم تو خدا دیتا ہے، نہ کہ ان کاہنوں اور ساحروں کے شیاطین۔ اس لئے ہر انسان کو فکر و تدبر کی آزادی ہے۔ وہ براہ راست، بغیر کسی شفیع یا درمیانی کڑی کے اپنے عقل و تدبر کے استعمال کا حق رکھتا ہے، اور خدا سے (یعنی منبع خیر سے) علم حاصل کرسکتا ہے۔ کاہنوں یا پجاریوں یا پوپوں، دستوروں، برہمنوں کی ضرورت نہیں کہ علم کی اجارہ داری ان کی ہو اور لوگ اپنی عقلی کاوش اور فکر سے ہی نہیں، بلکہ خود "علم" سے محروم کردئے جائیں۔

کیوں ؟ تاریخ شاہد ہے کہ عقل انسانی کی جب کوئی جماعت ٹھیکہ دار بن جاتی ہے، اور دنیا میں شیطانی آمریت کی بنیاد ڈال کر جمہور کو ان کی تخلیقی قوتوں کے استعمال سے روک دیتی ہے تو وہ قوم فنا ہوجاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ پوری مکی زندگی میں رسول عربی صلعم کی لڑائی اس جماعت سے رہی جو سدنۂ قریش، (یعنی مکہ کے پجاری) کے نام سے مشہور تھی۔ اور خانۂ کعبہ اور حج کے سلسلے میں نہ صرف پوجا پاٹ اور عبادت کرنے کے اعمال کو جانتی تھی، بلکہ اُن چیزوں کی واحد اجارہ دار بھی وہی جماعت تھی۔ عبادت اصنام اور ارکان حج اور حج کی تاریخوں کا تعیّن، حج کے مہینوں کا حرام یا حلال کرنا، جنگ و صلح کے قاعدے مقرر کرنا، لٹریچر کے ڈھنگ اور اس کی حدوں کو متعین کرنا، پیشین گوئی کرنا، اور سفر کے لئے سعد و نحس گھڑیاں مقرر کرنا سب ایک مخصوص جماعت کے قبضہ میں تھا۔

جب رسول عربیؐ نے ان دو باتوں کا اعلان کیا کہ خدا خالق ہے، اور علیم ہے، تو گویا اس جماعت سے اعلان جنگ کردیا جو کہتی تھی کہ کوئی خالق نہیں ہے، یا اگر ہے تو خدا کے ساتھ اور اس کا ہمسر شیطان بھی ہے اور وہ اور اس کے جن علیم ہیں اور انسان کو ہمارے (یعنی پجاریوں کے) ذریعے سے علم دیتے ہیں۔ یعنی یہ آسان بات نہیں کہ ہر شخص علم حاصل کرسکے

سورۃ العلق کے عام ترجمے کا اصلی مفہوم سے مقابلہ

ارباب من دون اللہ کے خلاف اعلان بغاوت

عام ترجمہ	حقیقی مفہوم
سورہ ع۹۶ سورۃ اقرأ	وحی اول سورۃ العلق سورۃ الفاتحہ ام القرآن کنز
۱۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے	۱۔ اے محمدؐ! تو اپنے اس آقا کے نام سے نصیحت یا حمد شروع کر، جو پیدا کرنے پر قادر ہے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے (اس کے سوا کوئی آقا ایسا نہیں جو خلق کر سکے)
۲۔ اُس نے بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے	۲۔ اُس آقا نے ایک ناچیز قطرۂ خون سے آدم (محبت و عقل و مردانگی و اخلاق والا انسان) پیدا کر دیا۔
۳۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا اکریم ہے	۳۔ حمد و نصیحت شروع کر دے یقیناً تیرا آقا سب کریموں سے کرم میں زیادہ ہے (کہ اس نے تجھے نطق و علم دے کر ہدایت کرنے پر مامور کیا)
۴۔ جس نے علم سکھایا قلم سے	۴۔ اپنے اُس آقا کے نام سے نصیحت و حمد شروع کر جو قلم (عقل و مشاہدہ) کے ذریعہ سے علم دیتا ہے (جو سحر کی طرح راز نہیں بلکہ کتاب کی طرح ہر شخص کی عقل کے لئے عام ہوتا ہے)
۵۔ اُس نے آدمی کو سکھلایا جو وہ نہ جانتا تھا	۵۔ اُسی آقا نے (قلم کے ذریعے) ایسی باتیں آدم کو سکھائی ہیں جو وہ (حیوانی صورت میں) نہ جانتا تھا۔ (عقل و تمیز دے کر خدا نے انسان بنا دیا اور علم حاصل کرنے اور فائدہ حاصل کرنے کی صراط مستقیم کھول دی، یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ اپنے نفع کے لئے غلام کی تربیت نہیں کی، بلکہ خود غلام کے فائدے کے لئے اُسے عقل و علم دیا)

پیشین گوئی وغیرہ کے ذریعے سے دولت کمائی تھی۔ اگر ایسا خدا ہے جو سب کو یکساں علم دے سکتا ہے تو پھر پجاری عالموں کی اور اسرار غیب جاننے والے کاہنوں کی یا پوجا اور قربانی کے طریقے جاننے والے برہمنوں کی یا کسی نہ کسی خفیہ ترکیب (یا سحر) سے غیبی قوتوں کو خوش کرنے والی جماعتوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ علم، یا علم غیب جس سے بندہ بھی خوش رہے، اور خدا بھی اپنی نعمتیں نازل کرے سب کے لئے ایک سر بمہر راز نہیں رہتا۔ بلکہ خدا کی بنائی ہوئی ہوا اور بارش کی طرح عام ہو جاتا ہے۔

حروف مقطعات اور ترتیب نزول قرآن:

قرآن کی بہت سی سورتیں حروف ابجد (یعنی حروف مقطعات) سے شروع ہوتی ہیں۔ پہلی وحی بھی علم اور قلم کی تعریف سے شروع ہوئی ہے۔ اسی طرح اکثر سورتوں میں اس طرف اشارہ ہے کہ علم یا وہ حروف تہجی جن سے کلمات بنتے ہیں، اور جن سے سمجھ میں آنے والی زبان (لسان عربی مبین) بنتی ہے، یہ ہی خدا کی ہستی کی دلیلیں ہیں۔ یعنی خدا کا وجود اور اس کے علم کا طریقہ یہی ہے کہ انسان قدیم کتب سے علم حاصل کرے۔ تعلیم سے عقل پر جلا ہو گی۔ اور عقل سے اس پر روشن ہو جائے کہ علم ہی ذریعۂ نجات ہے اور حروف تہجی ہی ذریعۂ علم ہیں۔ نہ کہ ساحروں کے مہمل زمزمے اور کاہنوں کی بے معنی سجع۔

مطبوعات بیت الحکمت دہلی (ہند)

۱۔ پس منظر اسلام۔ چار حصوں میں
۱۔ اسلام سے پہلے دنیا کی حالت
۲۔ اسلام سے پہلے عرب کی حالت
۳۔ مقدمہ سیرت سیدنا محمد صلعم
۴۔ حیات محمدی قبل بعثت

۴۔ اعلان انقلاب
سورۃ العلق کا مفہوم
یعنی
فلسفہ وجود اور فلسفہ علم کی بحث کے
بعد اسلام کی بنیادی تعلیم کا خلاصہ

۲۔ ترتیب نزول
قرآن کریم
احادیث کی مدد اور
خود قرآن کے داخلی
مطالعہ کے لحاظ قرآن کی
مختلف سورتوں اور
رکوعوں اور آیتوں
کی ترتیب تنزیلی بتائی
گئی ہے اسکے علاوہ اس
پہلو کی تحقیقات بھی
درج کردی گئی ہیں

اُن نوجوان طلبہ کے نام

جو

اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال کا تاریخی ترتیب قرآن
اور تاریخ تمدن انسانی کی روشنی میں مطالعہ کر کے
اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں

اور

یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ فکر و عمل اسلام کی تعبیر میں
کیوں علمائے اسلام متفق الرائے نہیں

ارا کین بیت الحکمت، دہلی (ہند)

۵۔ بیان انقلاب
مفہوم سورۃ الحمد
جس میں
ہندوستان کے جو مسیا
اردو ترجمے بھی دیئے
گئے ہیں۔ اور یہ
دکھایا گیا ہے کہ
ترتیب تنزیلی
کے بغیر قرآن کریم
کا مطالعہ آسان
نہیں ہے۔

مشکلات قرآن کا انقلابی حل
تفسیر بالرائے نے جو مشکلات فہم قرآن
میں پیدا کردی ہیں، ان کا انقلابی حل،
ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں۔

سول ایجنٹ
سنگم کتاب گھر
اردو بازار
دہلی

مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ترتیب نزول قرآن کے مطابق فکر محمدی
اور قرآن کے ساتھ ساتھ عمل نبوی کو
پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے نمایاں کیا گیا ہے۔

انسان کا مقام

(ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ آل عمران ع ۲۰)

قرآن حکیم کی ابتدا انسان کی حقیقی جگہ متعین کرتی ہے۔ وحی اول میں جو بات کہی گئی ہے وہ اتنی بلند وسیع و عمیق ہے کہ جملہ کتب الہیہ اور بعد کا قرآن اسی کی تفسیر ہے۔ یہ وہ ذات ہے کہ اسے خلیفۃ اللہ فی الارض کا خطاب ملا۔ یہی وہ ہستی ہے جو دیگر جانداروں کے "فطری جبر" سے نکال کر عقل و شعور کے میدان "قدر" میں لا کھڑی کی گئی۔ اسی کو کلمات اللہ" کے جاننے کا شرف و شعور ملا۔ اور اسی کے لئے موت کے دروازے بند کر دئے گئے۔ تاکہ جب موجودہ جسم سے، اس کی روح نقل مکانی کرنے کے بعد دوبارہ "مبعوث" ہو تو اپنے اعمال کی تفصیلات خندہ پیشانی سے "ملک یوم الدین" کے سامنے پیش کر سکے، اور اُن کے بدلے (جزا) میں نعیم و سرور کی نہ ختم ہونے والی فراغتوں اور راحتوں میں طبق عن طبق گزرتا رہے۔ قرآن حکیم کل انسانیت کے لئے یہی "پیغام حیات و سرور" لایا ہے ولا تقولوا من یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء سے یہی مراد ہے۔ بلاشبہ جو لوگ شیطان یا شر کی ولایت چھوڑ کر اللہ کے ولی ہو جاتے ہیں وہی اپنی حقیقت تک، فائز ہوتے ہیں۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۰ قرآن اسی انقلاب کی تعلیم دیتا ہے اور سیرت سے اس انقلاب لانے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ ملا جامی نے سچ کہا ہے کہ :-

ایزد کہ نگاشت خامۂ احسانش	ابواب کتاب عالم و ارکانش
بر لوح وجود زد رقم فہرستے	در آخر کار نام کرد انسانش

سیرتِ قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(لقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر؟)

بادشاہی اور جاگیرداری دور ختم ہو رہا تھا۔ جمہوری اور مشینی دور کی ابتدا تھی اس وقت امام ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کی انقلابی روح کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ارباب حکومت اور امراء کے لئے تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کی حکمت، عقل، نقل اور کشف کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے تفسیر فتح الرحمان سے پہلے اسے اور المسوّی کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ متوسط طبقہ کے لئے شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۱۵۹ - ۱۲۳۹) نے تفسیر فتح الرحمان کے اصول کی تشریح کے لئے فتح العزیز لکھی اور جماعت مجاہدین تیار کی اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو قرآن و حدیث کا درس دیا اور انھوں نے قرآن کو امت مسلمہ کے عام لوگوں کی ہندوی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ وہ قرآنی دعوت انقلاب کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی تھے۔

قرآن کے پیغام کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سیرت نبوی کے سلسلہ میں اس کے تاریخی ادوار متعین کرلئے جائیں اور تاریخ تمدن انسانی کے پس منظر میں اسے اپنی اپنی زبان میں سمجھا جائے۔ اردو میں اس قسم کی مختصر سیرت مکتبہ بیت الحکمت دہلی سے مل سکتی ہے۔ اسے بیت الحکمت ہند نے ملکی زبانوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس سیرت میں قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کا ایک نمونہ "پیمان انقلاب" ہے۔ اس طرح سیرت کے قرآنی مطالعہ سے متعدد غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور حکمت قرآنیہ فکر انسانی سے بہت قریب آجاتی ہے۔

قیمت قسم اول چار روپے قسم دوم تین روپے

سول ایجنٹ سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی